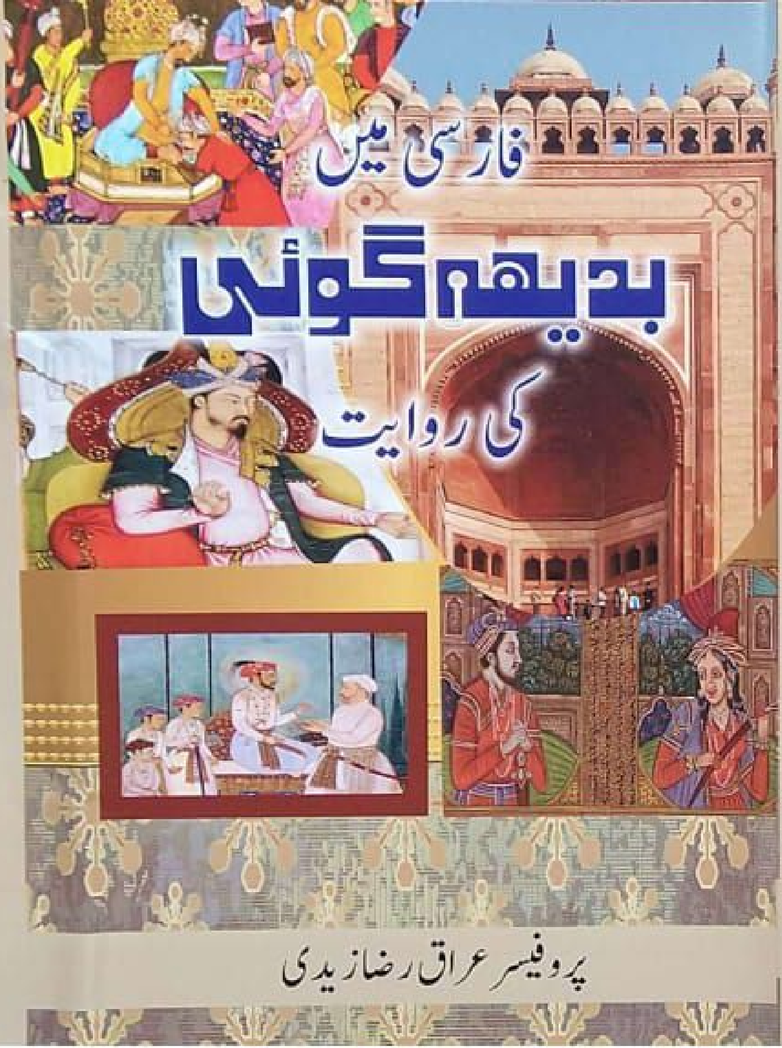
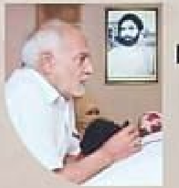


فارسی میں بدیہہ گوئی کی روایت

پروفیسر عراق رضا زیدی

FARSI MEIN BADIHA GOYEE KI RIWAYAT



By
Prof. Iraq Raza Zaidi

مصنف کی دیگر تصنیفات:

1) انجمن اصغریہ، سیتھل، بریلی، 1988

2) مثنویات فانی کشمیری کا تنقیدی جائزہ، 1994

3) جدوجہد آزادی میں پنجاب کے شعرا و ادبا کا کردار، 1995

4) فارسی میں تاریخ گوئی کی روایت، 2006

5) پیام مشرق میں فرہنگ و مقدمہ، 2008

6) حکیم کمال الدین حسین ہمدانی ایک عبقری شخصیت

7) محبوب رباعیات، 2017

8) Essays on Indo-Persian Language and Literature 2013

زیر طبع:

1) آئین رباعیات

IDARA-E-BOSTAN-E-QALAM
Saithal, District Bareilly, (U.P.)

بسم الله الرحمن الرحیم

فارسی میں بدیہہ گوئی کی روایت

پروفیسر عراق رضا زیدی

©

نام کتاب	:	فارسی میں بدیہہ گوئی کی روایت
مصنف	:	پروفیسر عراق رضا زیدی
کمپوزنگ وتزئین	:	ڈاکٹر یاسر عباس
تعداد	:	400
قیمت	:	300/-
مطبع	:	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس
طبع اول	:	۲۰۲۰ء
ناشر	:	ادارۂ بوستان قلم، سیتھل، بریلی، یوپی
ملنے کے پتے	:	☆ شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
		☆ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر دہلی
		☆ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، علی گڑھ
		☆ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، ممبئی

Farsi Mein Badiha Goyee Ki Riwayat

By Prof. Iraq Raza Zaidi

Mob.: 09818818215 **Email:** iraq_raza@yahoo.co.in

ISBN: 93-85295-10-1

First Edition :2020

Price: **300/-**

انتساب

اپنے مہربان اور مشفق اساتذۂ کرام

☆ جناب سید محبوب حیدر رضوی محبوبؔ سیتھلی

بانی ادارۂ بوستان قلم، سیتھل، بریلی

اور

☆ پروفیسر زینت اللہ جاوید

سابق صدر

این ایس ایم کے انسٹی ٹیوٹ

آف پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ (مالیر کوٹلہ)

کے نام

جن کی تربیت سے

شعر گوئی اور نثر نگاری کے رموز سے واقف ہوا

پروفیسر عراق رضا زیدی

رویـد و تــاج ستـمـگـر بـزور اندازید
بـرای قـوت بیـچــار گـان دهید امداد

☆☆☆☆☆

عیــان کـن کـل حـجـاب معـنوی را
کـــه مــن مــی زیستـم دور مـجــازم

فہرست

مقدمہ

خدا کے فضل و کرم سے ادب میں بھی خوب سے خوب تر کی تلاش میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ راقم کے مقالوں کے اکثر و بیشتر عنوانات اور مضامین کبھی کسی ادیب سے دور تک نہیں ٹکراتے ہیں۔ مثلاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں منعقد ہونے والے سیمیناروں میں شعبۂ فارسی اور انسٹیٹیوٹ آف پرشین ریسرچ کی جو روداد کتابی شکل میں موجود ہے ان میں خاص طور سے دیکھا جا سکتا ہے۔ عہد سلطنت پر ہونے والے سیمینار میں حسن سجزی، امیر خسرو، بدر چاچ اور مسعود سعد سلمان کے قصائد، غزلیات یا مثنویات پر مقالہ لکھنا آسان کام تھا لیکن ''رباعیات مسعود سعد سلمان'' کے ذریعے اس کی سوانح حیات اور شعری صلاحیت کا اجاگر کرنا کار دارد تھا۔ اسی طرح ''**نقش غزل در ادبیات فارسی**'' میں سعدی یا حافظ وغیرہ کی غزلوں پر مقالہ لکھنا عام روش پر مبنی ہوتا لیکن راقم نے یہ جستجو کی کہ عربی غزل سے فارسی غزل میں انفرادیت کس طرح ہے پر قلم اٹھایا ہے۔ نتیجۂ مقطع اور تخلص کے استعمال پر تحقیقی کام کرتے ہوئے باور کرایا کہ عربی غزل میں تخلص کا استعمال نہیں ہوتا اور فارسی میں یہ استعمال بتدریج کیسے ترقی کرتا رہا۔ ہر دور کی فی صد غزلوں کے مقطعوں پر بھی بحث کی۔ اسی طرح جب ''**نقش مثنوی در ادبیات فارسی**'' عنوان دیا گیا تو میرا عنوان تھا ''مثنویات کی بحریں اور عروضی نظام'' جس میں

''وتد مفروق'' کی اہمیت کوسن کر ایرانی اساتذہ نے کئی سوال اٹھائے جن کا تشفی بخش جواب سن کر وہ مطمئن ہو گئے۔مزید برآن پروفیسر آذرمیدخت صفوی، پروفیسر اسد علی خورشید کا اعتراف کرنا کہ ہمارے سیمیناروں کے لیے آپ محنت اور تیاری کرتے ہیں اور سب سے جداگانہ مقالہ لکھتے ہیں، خصوصاً پروفیسر آذرمیدخت صفوی صاحبہ کا فرمان میرے لیے سند کی حیثیت رکھتا ہے۔دہلی یونیورسٹی میں بھی پروفیسر چندر شیکھر، پروفیسر ریحانہ خاتون اور پروفیسر بلقیس فاطمہ حسینی بھی اپنے سیمیناروں میں یہی امید رکھتی رہی ہیں۔دہلی یونیورسٹی کے ''**تاریخ نویسی در ادب فارسی هند**'' میں راقم کا عنوان تھا ''**تاریخ نویسی در تــاریـخ گوئی**'' اس سیمینار میں ایران سے پروفیسر مصطفوی صاحب تشریف لائے تھے۔موصوف کو کافی دیر بعد اندازہ ہوا کہ مقالے کا عنوان کیا ہے۔مقالہ ختم ہونے پر انہوں نے پورا مقالہ دوبارہ پڑھوایا اور تعریف کی اس مقالہ کی تمہید پر کافی ہنگامہ بھی ہوا تھا، جس میں پروفیسر اقتدار حسین صدیقی اور پروفیسر شرف عالم صاحب پیش پیش تھے لیکن پروفیسر چندر شیکھر صاحب نے حسبِ وعدہ پورا مقالہ شائع کیا اور قارئین نے تحسینی کلمات سے نوازا۔

غرض کہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں ''فارسی میں تاریخ گوئی کی روایت'' جو فارسی ادب کی تاریخ میں اس موضوع پر مکمل پہلی کتاب ہے اور اب یہ دوسری کتاب ''فارسی میں بدیہہ گوئی کی روایت'' شائع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔اس عنوان کے ساتھ انصاف کرنا بہت مشکل کام تھا۔کتنی تاریخی کتابیں، تذکرے، دیوان اور ناقدین کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔اکثر کتابوں میں کچھ بھی حاصل نہ ہوا اور کچھ تذکروں میں اتنا مواد تھا کہ انتخاب کرنا پڑا۔غرض کہ تقریباً دس سال کی محنت و جانفشانی پر مبنی یہ کتاب مکمل تو نہیں کہی جا سکتی لیکن آنے والوں کے لیے سنگ میل کی حیثیت ضرور رکھتی ہے۔واقعے کی

چھان بین کرنا، اشعار کا درست شائع کرنا، واقعات کو تاریخی پس منظر میں دیکھنا یہ سب وہ کاوشیں تھیں جن پر کھرا اترنا بہت مشکل کام تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کی مہربانی سے اس منفرد عنوان پر جس پر ابھی تک کچھ سامنے نہیں آیا اس پر کام کرنا خاکسار کے حصے میں آیا۔ خدا کے بعد محمدؐ و آل محمدؑ کا صدقہ ہے کہ یہ کام مکمل ہوا۔ بہت مشکل تھا اس کام کا پایہ تکمیل تک پہنچنا اگر میرے عزیز اور دوست مثلاً پروفیسر عبد الحلیم، ڈاکٹر سید کلیم اصغر، ڈاکٹر محسن علی اور ڈاکٹر زہرہ خاتون وغیرہ اصرار نہ کرتے رہتے۔ اسی طرح میری اہلیہ ناہید اختر، بیٹی ثنا خاتون اور بیٹے الہام زیدی جن کی وجہ سے گھر میں سکون کا ماحول رہا اور میں یکسوئی سے اپنا کام انجام دیتا رہا۔ ڈاکٹر یاسر عباس کا سب سے اہم کردار رہا جنہوں نے راتوں کو جاگ جاگ کر میرے حکم کی تعمیل کی اور اس کتاب کو سجانے سنوارنے کا سہرا اپنے سر باندھا۔

بقول پروفیسر عزیز الدین صاحب یہ دور ادبی قحط الرجال کا دور ہے۔ کوئی ایسا دانشور، مفکر یا ادیب دکھائی نہیں دیتا جس سے کچھ مشورہ لیا جائے سوائے چند دانشوروں کے۔ خدا کا شکر ہے کہ فارسی کے ان چند دانشوروں میں سرفہرست ایک نام پروفیسر آذرمیدخت صفوی کا ہے۔ جن کی شرکت ہر سیمینار اور ورکشاپ کی کامیابی کی دلیل ہوتی ہے۔ اس کتاب کا ''پیش لفظ'' لکھنے کے لیے میں ان کا احسان مند بھی ہوں اور شکر گزار بھی، اسی طرح پدم شری پروفیسر ریحانہ خاتون ہمہ وقت فارسی ادب کی خدمت میں مصروف رہتی ہیں۔ مجھ پر ہمیشہ مہربان رہیں۔ دہلی یونیورسٹی میں جب پروفیسر شریف حسین قاسمی صدر تھے اور ایکسٹینشن لیکچر (Extension Lecture) کرانے کی ذمہ داری محترمہ کے سر تھی۔ میں نیا نیا جامعہ میں آیا تھا، جہاں میری ایک سینیر (Senior) ساتھی نے ایک بار کہا کہ دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ جامعہ والوں کو جاہل کہتے ہیں۔ دوسرے دن ہی ریحانہ آپا راستے میں مل گئیں اور دہلی یونیورسٹی میں ایکسٹینشن

لیکچر (Extension Lecture) دینے کا دعوت نامہ دے کر وعدہ لیا۔ پھر تقریباً ہر سال ہی ایک لیکچر خاکسار کے حصے میں آتا رہا۔ اس کتاب میں ''بدیہہ گوئی میں طاق: زیدی عراق'' عنوان کے موصوفہ کے مضمون کے لیے تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اسی طرح پروفیسر بلقیس فاطمہ حسینی جو خود شاعرہ بھی ہیں، بڑی بہن کے سارے حقوق استعمال کرتی ہیں۔ ریٹائر (Retire) ہونے کے باوجود نہایت فعال ہیں اور دین و دنیا دونوں سے متعلق مقالے لکھ کر دونوں ہاتھوں میں لڈو لے کر برابر کام کرتی رہتی ہیں۔ AIPTA (آل انڈیا پرشین ٹیچرس ایسوسی ایشن) کی نائب صدر ہیں نہایت مہربان اور مشفق ہیں 'عصر حاضر کا بدیہہ گو شاعر'' کے عنوان سے مضمون لکھ کر ممنون و مشکور کیا ہے۔ یہ سب فارسی ادب کے بڑے نام تھے۔ جنہوں نے اپنا قیمتی وقت وقف کیا۔ فارسی ادب پر تحریر شدہ یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے۔ لہذا دل ہوا کہ کسی اردو ادب کے دانشور کی رائے بھی اس کتاب میں شامل ہوجائے تو بہتر رہے گا۔ یہ خیال آتے ہی ذہن اردو کی جائے پیدائش دکن کی طرف چلا گیا، جہاں سے بلبل دکن جنہیں ۴/ مارچ ۲۰۲۰ء کو لکھنو یونیورسٹی کے عالمی سیمینار کے کلیدی خطبے کے بعد ''بلبل ہند'' کے خطاب سے نوازا گیا، لہذا اب وہ بلبل ہند کہلائی جا رہی ہیں۔ پروفیسر فاطمہ بیگم پروین، سابق وائس پرنسپل فیکلٹی آف آرٹ اور سابق صدر، شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد جن کے بنا حیدرآباد کیا دکن میں کوئی سیمینار منعقد نہیں ہوتا اور اب تو دہلی، لکھنو، سنبھل، رامپور، مہاراشٹر اور بہار وغیرہ کی دانشگاہوں میں بھی ان کا ڈنکا بج رہا ہے۔ نہایت خوبصورت آواز، مومن کے مصرعہ والی ''شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو'' جب مقالہ پڑھتی ہیں تو سامعین پر سکوت کی کیفیت طاری رہتی ہے، وہ ایک گھنٹہ کا مقالہ ہو یا اس سے زیادہ کا کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کتاب کے عنوان پر ہی ایک نظر ڈالتے ہوئے مقالہ لکھ کر جہاں اس کتاب کی

وقعت میں اضافہ کیا ہے وہیں خلوص و محبت کا اظہار کرتے ہوئے احسان فرمایا ہے۔ میں تہہ دل سے ان کا شکر گزار ہوں۔ آخر میں اپنے تمام قارئین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو اس کتاب کو پڑھ کر اس کی کمیوں اور راقم کی کوتاہیوں سے آگاہ کریں گے تاکہ دوسرے ایڈیشن کو ان غلطیوں سے پاک کر دیا جائے۔

والسلام

راقم

پروفیسر عراق رضا زیدی

فروری ۲۰۲۰

پیش گفتار

سب سے پہلے میں پروفیسر عراق رضا زیدی صاحب کی خدمت میں دلی مبارک باد پیش کرنا چاہتی ہوں کہ انہوں نے مشرقی شعر و ادب کے ایک ایسے دلچسپ اور قابل توجہ پہلو پر روشنی ڈالی اور اس کو مورد بحث و بررسی قرار دیا جو متاسفانہ، زمانۂ حاضر میں بعض دیگر مشرقی شعری روایات کی طرح، فی الجملہ بے توجہی اور بے التفاتی کا شاکی ہوسکتا ہے۔ میرا اس سلسلے میں یہی التماس ہے کہ " گاهی گاهی باز خوان "۔ کیونکہ، دوستان عزیز، اس بازخوانی میں مشرقی ادب اور علوم کی بے شمار جہات، خلاقیت ذہنی کے متحیر کن شواہد اور ہمارے فرہنگ و تمدن کی عظیم الشان روایت کے وہ حسین اور معنی خیز نوادر آشکار ہوتے ہیں جو امتداد زمانہ، بدلتے ہوئے ذوق اور مغربی شعریات کے خواہی نخواہی تہاجم و تقلید کے سبب ہماری بے پرواہی کا نشانہ بن گئے۔ بدیہہ گوئی یعنی فی الفور اور مناسب مقتضائے حال کلام کی تخلیق پر قدرت اسی زمرہ میں آتی ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ بدیہہ گوئی نہ صرف ہمارے کلچر اور ادب کا اہم حصہ رہی بلکہ اس کے شعری نمونوں کے استیعاب سے ہم کو ادوار گذشتہ کے اہالیان فکر و فن اور استادان شعر و سخن کی پرواز ذہنی، ان کے تبحر علمی، حاضر دماغی، موقع سنجی، بیان و بدیع، قافیہ و عروض پر ان کی زبردست قدرت کا پتہ ملتا ہے جو " علم در سینه نه که در سفینه " کی جیتی جاگتی اور مرعوب کن مثال

ہے۔" **غلطاں غلطاں همی رود تا لب گوی** " کے بے ساختہ اور فی البدیہہ مصرع کی موزونیت اور ابداع نے اگر ایک مکمل صنف سخن کا آغاز کیا تو رودکی، فرخی، معزی، عمعق بخارائی، صائب تبریزی اور بعض دیگر متاخرین نے اس کو بام عروج پر پہنچایا۔ لائق تحسین ہیں عراق رضا زیدی صاحب کہ انہوں نے شعری صلاحیت کے اس بے پناہ اور بے ساختہ اظہار کو اپنا موضوع سخن بنایا اور اس کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بدیہہ گوئی کے اہم اور پرکشش نمونوں سے قارئین کو لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کیا۔ تقریباً ۵۵ موضوعات پر پھیلی ہوئی ان کی یہ تالیف بہت سے اہم اور قابل استفادہ پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ عربی ادبی روایت کے مختصر بیان کے بعد وہ ایران میں فارسی زبان کے احیاء سے اس سلسلے کو جوڑتے ہیں اور سامانی، غزنوی، ہندوستان کے عہد سلطنت اور ایران کے سلجوقی سلاطین کا ذکر کرتے ہوئے عہد گورکانی ہند پر انھوں نے اپنی خصوصی توجہ مرکوز کی ہے۔ ادوار کے ضمن میں بے شمار معروف شخصیات وشعرا، ان سے منسوب تاریخی واقعات، بدیہہ گوئی میں ان کا کمال اور بہت سے علمی وادبی معاملات کی تفصیلات کا دلچسپ بیان کتاب کی اہمیت میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی یہ تالیف ہماری شعری وراثت اور تہذیب وتمدن کی ایک اہم دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔

ناظرین گرامی زیدی صاحب سے ہمیں یہی توقع بھی ہے۔ ان کو جاننے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ اپنی تحریر وتقریر میں ہمیشہ ہی اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ پیش پا افتادہ، بے روح، خشک اور آزمودۂ خاص وعام موضوعات سے اپنا دامن بچا کر کچھ نیا اور دلچسپ سامنے لایا جائے۔ چنانچہ خواہ سیمینار اور کانفرس کا شفاہی مقالہ ہو یا مطبوعہ تحریر، ان کا انتخابِ موضوع بیشتر اوقات عام روش سے ہٹ کر، منفرد اور دل نشین ہوتا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ شعر وادب، فنون علمی اور نقد کے ان پہلوؤں پر ان کی نظر ہے جو

موجودہ دور میں کم لوگوں کے دائرہ تبحر میں شامل ہیں: عروض، تاریخ گوئی، بیان و بدیع کے نکات، علم قافیہ، بحور و اوزان، رباعی کے وزن وغیرہ۔ میرا دعویٰ بے دلیل نہ کہا جائے لہٰذا ان کے چند مقالات کے عناوین آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہوں:

۱- بررسی وزن رباعیات حافظ
۲- غزلیات حافظ و غالب کی عروضی ہم آہنگی
۳- جناب کالیداس گپتا رضا کی عروضی فہمی
۴- رباعیات مسعود سعد سلمان
۵- بازگشت......کمال احمد صدیقی کی عروضی بے راہروی
۶- غزلیات بیدل کا عروضی تجزیہ
۷- تاریخ گوئی در تذکرہ نویسی
۸- حافظ شیرازی، تاریخ گوئی کا پہلا صاحب دیوان شاعر وغیرہ

اس کے علاوہ عراق صاحب بعض اوقات ایسے ادب پاروں پر روشنی ڈالتے ہیں جن میں کوئی نئی بات ہو۔ بطور مثال: جب میں مرکز تحقیقات فارسی کے ڈائرکٹر کے عہدہ پر فائز تھی تو ہر سال ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کرواتی تھی جس میں ملک اور بیرون ملک کے اساتذہ بڑی تعداد میں شرکت کرتے تھے۔ پروفیسر عراق رضا زیدی ہر سال میری دعوت پر تشریف لاتے اور اپنا گراں قدر علمی مقالہ پیش کرتے تھے۔ دو ہزار گیارہ (۲۰۱۱ء) میں ''ادبیات داستانی فارسی'' کے موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار میں زیدی صاحب نے غنیمت کنجاہی کی مثنوی ''نیرنگ عشق'' پر مقالہ پڑھا۔ (جو اَب سیمینار کے مقالات کی جلد دوم میں مرکز تحقیقات فارسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شایع ہو چکا ہے) غنیمت کی مثنوی اور اس پر عراق صاحب کا مقالہ دونوں ہی خاموش پانی میں پتھر پھینکنے کے مترادف کہے جا سکتے ہیں کیونکہ ان کا موضوع وہ مسئلہ ہے جو ماضی کے شعری ادب میں شاید بہت

کم، ہاں غزل میں بطور استعارہ نظر آتا ہے، لیکن بقول عراق رضا صاحب جس کی گونج آج کل پارلیمنٹ اور قانون کے ایوانوں تک پہنچ چکی ہے، یعنی ایک مرد سے دوسرے مرد کا عشق۔ عراق صاحب نے بڑے سنجیدہ اور مدبّرانہ انداز سے مثنوی کی تحلیل وتنقید کی ہے مطلع میں صنعت براعت استہلال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے (شاہد اور عزیز داستان کے ہیرو ہیں):

بنام شاهد نازک خیالان

عزیز خاطر آشفته حالان

وہ آگے بڑھتے ہیں اور اپنے مقالے میں اس کے حسن وقبح کا اجمالی جایزہ لینے کے بعد ایک اہم اخلاقی نتیجہ کی طرف خوانندہ کی راہنمائی کرتے ہیں۔ پروفیسر قاضی عبدالستار صاحب معروف اہل قلم اور ادیب اس جلسے کی صدارت فرمارہے تھے جس میں عراق صاحب نے یہ مقالہ پڑھا۔ انہوں نے اس کاوش کو بے حد سراہا اور موضوع کے انتخاب کی داد دی۔

آمدم برسر مطلب، اسی جدت پسندی اور منتخب موضوعات کی تلاش نے عراق رضا صاحب کو بدیہہ گوئی پر قلم اٹھانے کیلئے آمادہ کیا جو زیرنظر تحریر کی شکل میں پیشکش ناظرین ہے۔ انہوں نے اس سیر حاصل مقالے میں فارسی میں بدیہہ گوئی کی روایت کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور ابتداء سے لے کر ہندوستان میں شاہانِ مغلیہ کے دربار تک اس کے پروان چڑھنے اور برگ و بار لانے کا بیان بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے اور متعدد شعراء کے کلام سے ان کے فی البدیہہ اشعار کے نمونے مع ان سے منسوب واقعات و روایات کے نقل کئے ہیں۔

جیسا کہ قبلاً عرض کیا گیا مشرقی ذوق اور شعریات، میری مراد یہاں عربی،

فارسی اور اردو کی شعریات سے ہے، اپنا الگ مقام اور بعض منفرد خصوصیات کے حامل ہیں جو بدو کارسے ہی اس کے ادب وشعر کا جزو ہیں۔ بدیہہ گوئی اگرچہ کوئی صنف نہیں، بیان و بدیع کی شق نہیں، نقد ادبی کی قدیم وجدید اقسام میں اس کا شمار نہیں، لیکن مشرقی نثر وشعر میں اس کا سکّہ ہمیشہ چلا ہے اور ذوق لطیف نے اس کو بے جھجک سراہا ہے! بظاہر اس کا تعلق سیدھا سادھا انسانی فطرت کے اس عاطفہ سے ہے جو باموقع، برمحل اور برجستہ بات سے متاثر ہوتا ہے۔ زرین کوب، ایران کے مانے ہوئے ناقد اور ادیب کہتے ہیں:

"بسا که تاثیر شعر در طباع و نفوش مردم هم از لحاظ شناخت هنر و هم از لحاظ روانشناسی اهمیت بسیار دارد......بسا که نیروی معنوی شعر مناسب حال توانسته است مردم افسرده را به هیجان در آورد و به طلب حق و افتخار بر انگیزد یا خشم و التهاب مردم را فرو نشاند......"

(نقد ادبی)

برمحل اور باموقع شعر کی تاثیر کی عمدہ مثال رجز گوئی اور رجز خوانی بھی کہی جاسکتی ہے (گو کہ اس کا فی البدیہہ ہونا ثابت نہیں) جس کا ہمارے ادب میں ایک خاص مقام ہے، خصوصاً حماسی ادب اور مراثی میں۔

جاحظ کا قول ہے کہ اقوام باستانی میں لوگوں کے جذبات اور ان کی عقل کی عنان اختیار سب سے زیادہ شعرا کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ یونانی شاعر سوفوکل کا مشہور واقعہ بھی اس تاثیر کی نشاندہی کرتا ہے۔ نظامی عرضی سمرقندی چہار مقالہ میں ایک اچھے شاعر کیلئے جو لوازم اور شرایط ضروری بتاتے ہیں اس میں حضور ذہنی اور بداہت سخن بھی ہیں۔ وہ شعر کو

ایک ایسی ''صنعت'' سے تعبیر کرتے ہیں جس سے بعض اوقات ''**عظام امور ساختہ شدہ است**.''

اس تاثیر کو بدیہہ گوئی سے مزید تقویت ملتی رہی۔ قدیم عرب اور زمانہ جاہلیہ کے اسواق عرب علی الخصوص 'سوق عکاظ' کی محافل شعر و ادب میں برمحل شعر گوئی، نثری فی البدیہہ مخاطبات اور نقد و نظر کے اظہار کا تذکرہ کتب تاریخ و تذکرہ میں برابر ملتا ہے۔ یہ برمحل شعر گوئی اکثر نقد و تبصرہ کی محرک بھی ہو جاتی تھی جس کو ہم نقد ادب کی پہلی اور ابتدائی شکل بھی کہہ سکتے ہیں: عہد عباسی میں ایک شخص خلف بن احمر کے پاس گیا اور کہا کہ تیری تعریف میں شعر کہنا چاہتا ہوں۔ اجازت دے۔ خلف کی اجازت پا کر اس نے دو شعر اس کی مدح میں کہہ کر سنائے۔ خلف نے کہا ''تو مجھے چھوڑ لیکن گوسفندوں سے دور رہنا مبادا تیرے شعر کو گھاس سمجھ کر چر جائیں!''

ایرانی ادبی روایت میں ورود اسلام سے پہلے بھی شعر و ادب، موسیقی و خنیا گری کا رواج تھا اور زرتشت کی گاتا، مانیوں کے دینی اشعار اور پہلوی زبان کی بعض کتب میں کلام موزوں کے نمونے ملتے ہیں۔ قدیم شاہنشاہوں کی شعر دوستی اور ذوق ادبی کے قصّے بھی منابع عربی و فارسی میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خسرو کے سامنے عربی شاعر اعشیٰ میمون نے شعر کہہ کر سنایا۔ بادشاہ نے کہا اس کا ترجمہ کر کے سناؤ۔ تو لوگوں نے کہا شاعر کہتا ہے کہ بغیر کسی آزار اور بغیر عشق یا ہجر معشوق کے وہ رات بھر جاگتا ہے۔ خسرو نے کہا تو پھر یہ یقیناً چور ہوگا!

قدم آگے بڑھایئے تو مختلف ادوار میں فارسی کی ادبی روایت بدیہہ گوئی کے چند در چند نمونوں اور مثالوں کی شاہد نظر آئے گی۔ اکثر اوقات اس کے محرک شاعر کی صلاحیت و جودت طبع کا امتحان، کسی معترض کے ایراد و تنقید کا جواب، کسی کے کلام یا شعر پر ایراد و اعتراض اور پھبتی کسنا، کسی مخصوص موقع کی مناسبت سے فی الفور شعر کہہ دینا، ایک مصرع پر

دوسرا مصرع لگانا وغیرہ کہے جاسکتے ہیں۔ چند مثالیں دلچسپی کا باعث ہوں گی:

سلجوقی دربار کے دو معروف شعرا رشیدی اور عمعق بخارائی سے متعلق روایت کیا گیا ہے کہ ایک روز بادشاہ نے رشیدی کی غیبت میں عمعق سے پوچھا کہ رشیدی کا شعر کیسا ہے، اس نے جواب دیا ''بہت اچھا ہے لیکن نمک کی کمی ہے'' تھوڑی دیر میں رشیدی خدمت میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے کہا عمعق کہتا ہے تیرے شعر میں نمک کی کمی ہے۔ اس کا جواب دے۔ رشیدی نے بر بدیہہ یہ قطعہ کہا:

شعرهای مرا به بی نمکی
عیب کردی روا بود شاید
شعر من هم چون شکر و شهد است
واندرین دو نمک نکو ناید
شلغم و باقلاست گفته تو
نمک ای قلبتان ترا باید

ناصر بخارائی کی ملاقات سفر مکّہ کے دوران معروف شاعر سلمان ساوجی سے ہوئی تو سلمان نے جو اس وقت دجلہ کے کنارے چہل قدمی کر رہا تھا ناصر کی شعری صلاحیت کا امتحان کرنے کیلئے مصرع زیر پر مصرع لگانے کو کہا:

دجله را امسال رفتاری عجب مستانه است

ناصر نے فی الفور کہا:

پای در زنجیرو کف بر لب مگر دیوانه است

فیضی اور عرفی کے بابت روایت ہے کہ دونوں چمن میں ایک ساتھ ٹہل رہے تھے۔ فیضی نے مصرع کہا:

ای صبا آن زلف را بر چهرۂ زیباش نه

عرفی نے شعر کو یوں مکمل کیا:

آنچه بی رخصت ز جا برداشتی بر جاش نه

کبھی کبھی یہ بدیہہ گوئی شاعر کی جان بخشی بھی کروا دیتی تھی۔ سلطان تکش ایک بار نصر الدین سے جو شاعر بھی تھا اور قبیلہ کا سردار بھی کچھ ایسا ناراض ہوا کہ ایک شخص کو روانہ کیا کہ اس کو قتل کرے اور اس کا سر سلطان کے لیے لے کر آئے۔ ناصر الدین نے کسی طرح اس قاصد کو ہموار کیا اور خود اس کے ساتھ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا اور اس کے قدموں پر گر کر یہ بیت پڑھی:

سر خواستہ ای بہ دست کس نتوان داد

می آیم و بر گردن خود می آرم

بادشاہ اس قدر خوش ہوا کہ اس کو گلے سے لگا لیا اور بڑے عہدے سے نوازا۔

اواخر دورِ مغلیہ کے معرکۃ الآرا شاعر، ادیب اور صوفی بیدل دہلوی کی بدیہہ گوئی کے بعض نمونے کتب تذکرہ و تاریخ میں دستیاب ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم روایت وہ ہے جو اس کے بچپن سے متعلق ہے یعنی جب وہ طالب علم تھا۔ اس سے بیدل کی فطری ذہانت اور جودتِ طبع کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ شعر کہنے کی صلاحیت، خصوصاً برمحل اور فی الفور شعر موزوں کرنے کی اہلیت خدا داد ہی ہوتی ہے۔ آخر کچھ سبب ہے کہ شعر کو ''الہام'' اور شعرا کو ''تلامیذ الرحمٰن'' اور زمانہ قدیم میں ''جادوگر'' بھی کہا گیا! بیدل کا ہم مکتب لونگ چباتا رہتا تھا جس کی خوشبو بیدل کو بہت مرغوب تھی۔ چنانچہ اس کم سنی میں ہی اس نے ایک رباعی میں اس کا برمحل اظہار کیا:

یارم ہر گاہ در سخن می آید

بوی عجبش از دهنش می آید
این بوی قرنفل است یا نکهت گل
یا رائحه مشک ختن می آید

ناظرین باتمکین، بدیہہ گوئی کی لذت صرف شعر تک محدود نہیں۔نثر میں بھی یہ اپنا جلوہ دکھاجاتی ہے: چہار مقالے کے دبیر اسکافی کا خط امیر نوح بن منصور سامانی کے نام جس میں وہ سرسخت دشمن ماکان کوشکست دیکر قتل کردینے کی خبر صرف تین لفظوں میں فی البدیہہ دیتا ہے اس برجستگی کا متحیر کن نمونہ ہے:

" اما ماکان فصار کاسمہٗ. والسلام. "

سعدی کے اس زیبائی دوست درویش کا فقرہ جو مفلسی سے عاجز آ کر ایک شخص متمول کے پاس جاتا ہے جس کے بابت مشہور تھا کہ وہ تنگدستوں کی مدد کرتا ہے لیکن جس کی چڑھی ہوئی تیوریاں اور ناخوشگوار چہرہ دیکھ کر وہ الٹے قدموں یہ کہتا ہوا واپس آجاتا ہے " **عطایش را بلقایش بخشیدم** "،سحر حلال سے کم نہیں۔

اور دوستان عزیز نور جہاں کا " **یخ بست و شکست** " والا برمحل جواب بھی اپنی مثال آپ ہی ہے۔

یقیناً ایران و ہندوستان کا ادب بدیہہ گویی کے بے مثال نمونوں سے پُر ہے۔ البتہ ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے: بدیہہ گوئی کی روایت کے فروغ و گسترش و ہمت افزائی میں درباری کلچر کا بڑا اہم اور معنی خیز حصہ رہا ہے۔ بادشاہوں کے دربار، نوابین و سلاطین کی محافل، وزرا، امرا اور شاہزادوں کے حلقوں میں حاضر دماغی، حاضر جوابی اور بدیہہ گوئی ایک اہم صفت بلکہ ضرورت مانی جاتی تھی۔شعرا اور ادبا اس صلاحیت کو بڑھانے کی مشق کرتے ،حکمران ان کی تشویق اور آزمائش کرتے اور حسب موقع انعام

واکرام سے نوازتے۔خود فرخی اور میاں معزی کو بھی جو بعد میں ملکشاہ کی ناک کا بال بنا، اس آزمایش سے گزرنا پڑا تھا! بہر حال یہ شاہی دربار، اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ، بدیہہ گوئی میں شعرا کے لئے مہمیز کا کام کرتے رہے۔دیکھئے نظامی عروضی کس طرح اس کا اعتراف کرتا ہے:

" اما درخدمت پادشاه هیچ بهتر از بدیهه گفتن نیست که به بدیهه طبع پادشاه خرم شود و مجلس ها بر فروزد و شاعر به مقصود بر رسد و آن اقبال که رودکی در آل سامان دید به بدیهه گفتن و زود شعری کس ندیده است ".

دور کیوں جایئے خود ہمارے ملک کے ماضی قریب میں نوابان اودھ کے دربار میں اس بدیہہ گوئی نے غیر معمولی فروغ پایا۔سید انشا اس کی عمدہ مثال ہیں البتہ ان کی بد بختی نے ان کی حاضر جوابی کی صلاحیت کو ان کا بدترین دشمن بھی بنا دیا تھا۔

اگر ہم فارسی کی پروردہ اردو زبان پر نظر ڈالیں تو یہی دیکھتے ہیں کہ اکثر بڑے اور عظیم المرتبت شعرا بدیہہ گو بھی ہوئے ہیں۔اس کا بڑا مرعوب کن مظاہرہ مرثیہ گویوں کے یہاں نظر آتا ہے۔ہندوستان کے معاشرے میں مرثیہ گو شاعر، واقعہ کربلا سے متعلق مرثیہ کو منبر پر بیٹھ کر پڑھتا ہے یا کم سے کم ہمارے ماضی میں یوں ہی ہوتا تھا۔وہ زمانہ اہالیان ذوق کا زمانہ تھا۔منبر پر پڑھنے والا اور نیچے بیٹھ کر سننے والا دونوں شعر و ادب کے نکات سے بخوبی واقف ہوتے تھے۔ چنانچہ بعض اوقات مرثیہ خواں کے مصرعے پر اعتراض فی البدیہہ ہو جاتا اور ماہر مرثیہ گو اگر اس اعتراض سے متفق ہوتا تو اسی وقت مصرع یا وہ لفظ بدل دیتا۔میر انیس کا ایک واقعہ لکھا گیا ہے جب انھوں نے چار متواتر اعتراضوں کے

جواب میں چار بار منبر پر لفظ کو بدلا یہاں تک کہ سقم دور ہو گیا۔طول کلام کے خوف سے یہاں تفصیل دینے سے گریز کی جارہی ہے۔البتہ مرزا دبیر کے کمال بدیہہ گوئی کا ایک مختصر قصہ سنیے:ایک مجلس میں انھوں نے مصرع پڑھا''اس تیغ کا ارباب تواریخ میں غل ہے'' حاضرین محفل سے مخاطب ہو کر کہا حضرات! آپ میں سے کوئی صاحب دوسرا مصرع لگائیے۔لوگ قاصر رہے۔مرزا صاحب نے خود مصرع لگایا:''یہ مصرع تاریخ وفات جزو کل ہے'' سبحان اللہ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قدما نے اس ذوق کی آبیاری کی اور ہمارے لیے ایک بے بہا میراث چھوڑ گئے جس کی قدر دانی اور نگہداشت ہمارا فریضہ ہے۔خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارے ادبی کلچر میں بدیہہ گوئی ایسا رچ بس گئی تھی کہ آج بھی اہل شعر و سخن کی توجہ اس طرف ہے۔خود مؤلف کتاب پروفیسر عراق رضا زیدی نے نہ صرف اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے بلکہ وہ خود بھی اس ہنر میں مشاق ہیں اور اس کا مظاہرہ علمی اور ادبی محفلوں میں برابر کرتے رہتے ہیں۔میں ان سے گزارش کروں گی کہ اپنے ایسے اشعار کی وہ جمع آوری کریں تاکہ وہ گم نہ ہو جائیں اور ان کو شائع کیا جا سکے۔

میرے والد مرحوم سید محمد صادق صفوی، کہ میں آج جو کچھ ہوں فقط ان کے قدموں کے طفیل سے ہوں، فارسی کے جید عالم اور شاعر تھے اور بدیہہ گوئی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ان کے ذخیرۂ کلام سے فقط ایک مثال دینا چاہتی ہوں: ایران کے معروف ادیب و ناقد سعیدی سیر جانی سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ایک دفعہ سیر جانی صاحب ہندوستان آئے لیکن میرے والد سے ملاقات نہ ہو سکی اور وہ ایران واپس چلے گئے۔والد کو جب علم ہوا تو انہوں نے فی الفور چند ابیات نظم کیں اور سیر جانی صاحب کو ایران بھیج

دیں۔ان کو اس قدر پسند آئیں کہ انہوں نے ''مجلۂ یغما'' میں جو ایران کا معروف ادبی جرنل تھا، شائع کروائیں۔فقط تین ابیات حاضر خدمت ہیں:

ماه من دوش به این تیره دیار آمد و رفت
جلوه ناکرده به چشمم، بچه کار آمد و رفت
بلبلا هیچ شنیدی تو به کنج قفست
خلق گویند که در باغ بهار آمدو رفت
بزم پر شور و قدح دائر و مطرب به سماع
من صهبا زده مدهوش و نگار آمدورفت

بدیہہ گوئی کی روایت کا سلسلہ اور ذوق آج بھی ہمارے کلچر میں جاری وساری ہے۔قوی امید ہے کہ عراق رضا زیدی صاحب کی زیر نظر تالیف ماضی کی اس گراں بہا میراث کو مزید مستحکم اور دامنہ دار بنائے گی اور دوام بخشے گی۔

پروفیسر آذرمیدخت صفوی
مشاور و بانی و سابق ڈائرکٹر مرکز تحقیقات فارسی،
سابق ڈین آرٹس فیکلٹی و چیئرمین شعبہ فارسی،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

بدیہہ گوئی میں طاق زیدی عراق

پروفیسر ریحانہ خاتون (پدم شری)
سابق صدر، شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی

پروفیسر عراق رضا زیدی صاحب سے میں تقریباً ۱۹۹۵ء سے آشنا ہوں۔ میرے کرم فرما، میرے ہمدرد اور مددگار رہے ہیں میری بہت سی مشکلات میں۔ ان سے میری پہلی ملاقات جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اکیڈمک اسٹاف کالج میں ہوئی تھی۔ یہ اس وقت پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ میں لیکچرر تھے اور Refresher Course کرنے کے لئے آئے تھے اور میں ResourcePerson کی حیثیت سے جامعہ گئی تھی۔ انہوں نے کلاس میں دو چار سوال کچھ اس طرح اٹھائے کہ میں بعض Field میں ان کی لیاقت مان گئی مثلاً Prosody میں جو کمال آپ کو حاصل ہے میری نظر میں اس مہارت کا کوئی دوسرا شخص دکھائی نہیں دیتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ شاید یہ میری تھوڑی سی کم علمی پر منحصر ہو لیکن مانتے تو ہم سب لوگ ہیں کہ ان کو اس موضوع پر بڑی مہارت حاصل ہے۔

تاریخ گوئی آپ کا ایسا میدان ہے کہ اس سلسلہ میں آپ سے بات کر کے حیرت ہوتی ہے۔ میرے والد کا انتقال ۲۰۰۸ء میں ہوا تھا اور میں ان پر ایک کتاب شیخ الطایفہ کے نام سے شائع کرا رہی تھی اور طباعت اپنے بالکل آخری مراحل پر تھی۔ اتفاق سے ہم دونوں کو ایک Meeting میں ساتھ جانا ہوا لیکن ہم دونوں کی اچانک ملاقات

ایرپورٹ پر ہوئی۔ میں نے ان سے گذارش کی کہ ایک قطعہ تاریخ بابا کی وفات پر کہہ دو تاکہ میں اس کو بھی اپنی کتاب میں شامل کرلوں۔انھوں نے بغیر کسی حیل وحجت کے ایک گھنٹے کے سفر کے دوران فی البدیہہ دو قطعات تاریخ کہہ دیے، میں حیران رہ گئی۔علم نجوم بھی ان کے لیے ایسا موضوع ہے کہ اس سلسلے میں ان سے دوران گفتگو ایسی ایسی باتیں نکل کر آتی ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔حروف ابجد کے اعداد وشمار زبانی اگر چہ کم لوگوں کو یاد ہوتے ہیں لیکن جس طرح کا اظہار پروفیسر عراق کرتے ہیں میں نے کسی کو بھی اس طرح نہیں دیکھا۔سب لوگ لکھ کر اس علم سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن ذرا عراق صاحب کی وسعت نظر کو دیکھیے۔ایک بار ایک جگہ ہم دونوں VivaVoce کے ممتحن تھے۔جب نمبر دینے کی باری آئی تو اعداد کے بجائے حروف ابجد سے کام چلاتے اور مجھ سے وہ حرف زبانی کہہ دیتے تاکہ کوئی دوسرا نہ سمجھے وہ حروف Viva کے آخر تک ان کو یاد رہے جب رزلٹ فائنل بنانے کی باری آئی تو ان حروف کے اعداد وشمار لکھ کر رزلٹ بنا دیا۔ یہ ایسی خوبی ہے جو عام طور پر لوگوں میں نہیں پائی جاتی ہے۔

ان کی ایک اور خوبی جو ان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے خط سیاق کا علم۔ مجھے میرے پرووائس چانسلر جناب ٹنڈن صاحب کی طرف سے ایک مخطوطہ Manuscript جو گلاب گڑھ، جموں کے شری رگھو ناتھ جی مندر سے متعلق تھا، وہ Lockbook تھی اور اس میں انگریزوں کے فارسی آمیز اردو وانگریزی زبان میں خطوط بھی موجود تھے، یہ مندر اب سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے کا ہے اور اس میں حساب کتاب بھی ظاہر ہے اسی زمانے کا تھا۔غرض یہ کہ عراق صاحب نے اس کتاب کی Editing میں میرے ساتھ اپنے تقریباً چار ماہ صرف کیے اور خط سیاق میں لکھے گئے تمام اعداد وشمار کو آج کے اعداد وشمار میں تبدیل کرنے میں بھرپور مدد کی۔اسی طرح میں نے سرسید کی کتاب

''جام جم'' Edit کی۔اس کا آخری وہ حصہ جو بہادر شاہ ظفر کے بعد ان کی اولادوں کے حساب کتاب سے متعلق تھا وہ بھی خط سیاق میں تھا اور اس وقت تک جتنی بار بھی وہ کتاب شائع کی گئی اس حصہ کو حذف کر دیا گیا شاید اس کی وجہ یہ ہی رہی ہوگی کہ خط سیاق کا جاننے والا کوئی نہ ملا ہوگا، حیرت کی بات تو یہ ہے کہ خود سرسید کے ہاتھ کے قلمی نسخہ میں وہ موجود تھا، میری اس مشکل کو بھی عراق نے ہی حل کیا۔ یہ سب ان کے علم و دانشوری کی وہ خصوصیات ہیں جو ان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں کیونکہ نا تو ایسا تاریخ گوئی کا فن باقی رہ گیا بلکہ اختتامیہ کی کگار پر ہے۔ خاص کر ہندوستان میں Prosody کی زمین میں اس نوعیت کی مہارت اب تقریباً عنقا ہے بلکہ حالت تو یہاں تک بگڑ چکی ہے کہ چونکہ پڑھانے والے نہیں ملتے اس لیے اس موضوع کو ہی Course/ Syllabus سے نکال دیا جاتا ہے۔خط سیاق کے جاننے والے تو شاید ہی اب کہیں مل سکیں۔ یہ ساری خوبیاں جو ان میں پائی جاتی ہیں ان کو فارسی کے حوالے سے ذکر کر رہی ہوں ہوسکتا ہے عربی والے اس کمی کو پورا کرتے ہوں۔ بہر حال کل ملا کر میں یہ ذاتی طور پر کہہ سکتی ہوں کہ عراق نہایت ملنسار، مددگار اور ہمدرد ہیں اور علمی میدان میں آپ بغیر مذہب وملت کی تفریق کے ہر ایک کی بڑھ چڑھ کر مدد کرنے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

جہاں تک اس کتاب ''فارسی میں بدیہہ گوئی کی روایت'' کی جامعیت، افادیت واہمیت کا سوال ہے تو جو شخص خود اس فن میں طاق ہو اور وہ اپنے مقالے کے ساتھ انصاف نہ کرے یہ ناممکن ہے۔مشکل پسندی عراق کی فطرت میں شامل ہے۔اسی لیے وہ اپنے مقالات کے لیے ایسے عنوانات کا انتخاب کرتے ہیں جن پر دوسرے دانشوروں کی نظر کم ہی جاتی ہے۔''بدیہہ گوئی'' کا انحصار کئی علوم پر ہے، مثلا تاریخ نویسی، شعر گوئی، عروض و بلاغت، تاریخ گوئی، علم حساب، تذکرہ نویسی، علم رمل وجمل وغیرہ علوم سے واقفیت ہونے

کے ساتھ ساتھ قبل اسلام سے آج تک کی تاریخ سے واقفیت ہونا ضروری ہے۔ بادشاہوں، ان کی معشوقاؤں، ان کے وزیروں، سفیروں اور غلاموں کے واقعات اس صنف سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح صوفیوں اور ان کے مریدوں کے تذکرے بھی اس ذیل میں دکھائی دیتے ہیں۔ سب سے بڑا کارنامہ شعراء کے حصے میں آتا ہے جو واقعات وحادثات کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے ممدوح کے رنج وغم کو مسرت وانبساط میں بدلنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ اس ذیل میں یہاں دو واقعے اس کتاب سے درج کرنا بہتر ہوں گے۔ پہلے واقعے یا حادثے کا تعلق محمود غزنوی، اس کے غلام ایاز اور ملک الشعرا عنصری کے اردگرد گھومتا ہے اور اس کے دربار کے تمام وزراء وامراء سے تعلق رکھتا ہے۔

''زلف ایاز سے متعلق ہی عنصری نے فی البدیہہ ایک رباعی کہی تھی۔ جس کے پس پشت عجیب واقعہ نمودار ہوا تھا۔ ہوا یوں کہ ایک رات محمود غزنوی شراب کے نشہ میں غرق تھا۔ ایاز اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دونوں گالوں پر اس کی خوبصورت گرہ دار دراز زلفیں اس طرح منڈلا رہی تھیں کہ محمود ان سے کھیلتے کھیلتے شرع کی حدوں کو عبور کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں ایک محتسب وہاں آ گیا اور اس نے غزنوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ اس کی نصیحت سے ڈر گیا۔ لہٰذا اس نے قینچی نکال کر ایاز کو دے کر کہا تم اپنی زلفوں کو کاٹ دو۔ ایاز نے بادشاہ کی مرضی کے مطابق بال تراش دیے۔ محمود، ایاز کو انعامات سے نواز کر نشے کی حالت میں سو گیا۔ صبح کو جب بیدار ہوا تو رات کے واقعے کو یاد کر کے مضطرب و پریشان ہونے لگا۔ اسی ندامت کے

عالم میں بستر پر کبھی بیٹھتا اور کبھی لیٹ جاتا اور کبھی اٹھ کر کھڑا ہوجاتا۔ کسی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ بادشاہ سے کوئی بات کرسکتا۔ لیکن اس کے ندیم خاص علی حاجب نے عنصری کو سارا واقعہ سنا کر کہا کہ کوئی ایسی تدبیر کرو کہ بادشاہ کی خود طبعی لوٹ آئے۔ عنصری اس ندیم کا حکم بجالاتے ہوئے بادشاہ کے پاس گیا اور آداب بجا لایا۔ بادشاہ نے سر اٹھا کر کہا! تو دیکھ رہا ہے کہ کیا واقعہ پیش آیا۔ اس سلسلے میں کوئی ایسی بات کہہ جو موقع کے لحاظ سے موزوں ہو۔ عنصری نے فی البدیہہ رباعی لکھ کر سنائی جیسا صاحب ''خزانہ عامرہ'' نے تحریر کیا ہے:

"علی حاجب روبه عنصری آورده گفت توانی مزاج سلطان را به حال آید. عنصری پیش رفت و این رباعی بدیهه به عرض رسانید.

"مارا درین معنی چیزی بگوی که لایق حال باشد عنصری خدمت گردد بر بدیهه گفت:

﴿رباعی﴾

گر عیب سر زلف بت از کاستن است
چه جای به غم نشستن و خاستن است
وقت طرب و نشاط و می خواستن است
کآراستن سرو ز پیراستن است

سلطان از استماع این رباعی خیلی منشرح گردید و شعله جوالۂ غضب فرو نشست فرمود تا سه بار دهان عنصری را از جواهر پر ساختند

”.

(ترجمہ) ہمیں اس بارے میں کچھ سنا، جو اس واقعے سے مربوط ہو عنصری نے آمادہ ہو کر مندرجہ ذیل رباعی فی البدیہہ سنائی۔

معشوق کے سر کے سرے کے بال کا کٹ جانا کیا عیب کی بات ہے اور اس کے لئے اتنی بے چینی کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو نشاط وخوشی اور شراب نوشی کا موقع ہے کیوں کہ سرو کو جتنا کاٹا چھانٹا جاتا ہے اس کی زیبائش اور بڑھتی ہے۔

محمود غزنوی نے جب یہ رباعی سنی تو بہت خوش ہوا اور حکم دیا کہ اس کام کے بدلے عنصری کا منہ تین بار جواہرات سے بھر دیا جائے“۔

ایک دوسرا واقعہ دور اکبری سے متعلق ہے:

”ایران میں اکبر کا معاصر حکمراں شاہ عباس صفوی تھا، دونوں میں بڑی یگانگت رہی، دونوں ایک دوسرے کو قیمتی تحائف بھیجا کرتے تھے، ایک بار شاہ عباس صفوی نے ایک صفیر بھیجا، تو اس نے اکبر کے دربار میں آکر اپنے آقا کا ایک

مکتوب پڑھا۔جس کے سرورق پر یہ رباعی درج تھی۔

زندگی بہ سپاہ و فیل و لشکر نازد
رومی بہ سنان و تیغ و خنجر نازد
اکبر بہ خزینہ پُر از زر نازد
عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد

(مندرجہ بالا رباعی ''زندگی'' لفظ سے شروع ہوتی ہے۔ جو غلط ہے یہاں کوئی اور لفظ لکھا گیا ہوگا۔ جسے مصنف نے زندگی میں بدل دیا دربار میں جب یہ رباعی پڑھی گئی تو ہر شخص چونک اٹھا، اکبر نے فیضی کی طرف دیکھا جو اپنے محبوب شاہی آقا کی سبکی برداشت نہ کرسکا، فی البدیہہ یہ رباعی کہہ کر پڑھی:

فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد
دریا بہ گہر فلک بہ اختر نازد
عباسؑ بہ ذو الفقارِ حیدرؑ نازد
کونین بہ ذات پاک اکبر نازد

اس کوسن کر دربار میں مسرت وافتخار کی ایک لہر دوڑ گئی۔''

ان قطعات کے ذریعے جہاں اس دور کی سماجی ومعاشرتی زندگی کا اندازہ ہوتا ہے وہیں دو دوست ممالک کی آپسی چپقلش اور ان کی ذہنی کیفیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔لیکن ان حالات پر قابو پانے کا سہرہ شاعروں کے سر رہا ہے جنہوں نے اپنے تجربے اور زودگوئی کی بناپر محمود غزنوی اور اکبر اعظم جیسے بادشاہوں کے غمزدہ چہروں کو خوشی و انبساط میں تبدیل

کر دیا اور جہاں تک میں سمجھتی ہوں فارسی ادب میں اس موضوع پر پہلی بار کام کیا گیا ہے اور وہ بھی نہایت سلیقے، محنت اور لگن سے۔ کتاب کو ایک بار شروع کرنے کے بعد قاری کی دلچسپی بڑھتی جاتی ہے زبان نہایت آسان، سادہ اور دلکش ہے پر جہاں تک ممکن ہوا ہے سہل پسندی سے کام لیا گیا ہے حالانکہ موضوع نہایت مشکل، دقیق اور درباروں سے وابستہ ہونے کی بنا پر عام قاری کے ذہن پر بار خاطر ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میرے خیال میں اگر فارسی اشعار کا اردو ترجمہ بھی کر دیا جاتا تو اردو داں طبقے کے لئے مزید آسانی ہو جاتی۔ یہ کتاب فارسی ادب میں ایک گراں بہا سرمایہ سمجھی جائے گی جس سے شعری ادب کے ساتھ ساتھ تاریخ ہند و ایران کے کتنے ہی واقعات مؤرخین کے لیے چراغ ہدایت کا کام کریں گے۔

ریحانہ خاتون

Padmashri Awardee

عصر حاضر کا بدیہہ گو شاعر

پروفیسر بلقیس فاطمہ حسینی
سابق صدر، شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

سیادت، عبادت، ریاضت، زہد انسان کے وہ صفات ہیں جب کوئی اس سے متصف ہوتا ہے تو پھر وہ اپنے آپ کو آدمی کہنے کا مستحق ہے۔ کون آدمی جس کے بابا مسجود ملائک تھے۔ جسے ختم المرسلینؐ کی اولاد ہونے کا شرف منجانب اللہ ہے ہم سب اس بندہ خدا کو سید عراق رضا زیدی کہتے ہیں بزم شعر و سخن میں ان کا تخلص آدمی ہے۔ انتہائی خوش مزاج، متدین شخصیت ہیں حلقہ احباب وسیع ہے۔ یقیناً کچھ ایسے بھی ہوں گے جنہیں ان میں خامیاں بھی نظر آتی ہونگی لیکن یہ بھی انسان کی صفت ہے کہ لوگ انسان کامل کو نہ پہچان سکے تو ہم خاطی بندے تو مجموعہ خطا ہوتے ہی ہیں۔ میرے ایک شاگرد کو ان سے پرخاش ہے لیکن زیدی صاحب کی حلیم الطبعی نے کبھی ان کے لئے مجھ سے ایک لفظ شکایت کا ادا نہیں کیا۔

علمی، ادبی ذوق انہیں بے لوث کام کرنے پر مجبور کرتا ہے اور جب وہ کام کرتے

ہیں تو ''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا'' کا جذبہ یہ ذمہ داری کا اہم جذبہ اس وقت دیکھنے کو ملا جب آل انڈیا پرشین ٹیچرس ایسوسی ایشن (انجمن استادان فارسی کل ہند)(AIPTA) کا جنرل سکریٹری بنایا گیا۔ جنرل سکریٹری اظہر صاحب کے گذر جانے کے بعد انجمن جانکنی کی حالت میں تھی۔ ایگزیکیوٹو ممبران نے مجھے مشورہ دیا کہ صدر صاحبہ آزرمی دخت صفوی کو آمادہ کروں کہ انجمن کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ چند لوگوں نے اس میں تعاون کیا جس میں محترم استاد ڈاکٹر محمد یوسف، پروفیسر طاہر علی، پروفیسر عید محمد، پروفیسر منصور عالم اور پروفیسر غلام سرور کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ ناچیز نے بھی جس قدر ممکن ہوا عہدہ برآری میں کوتاہی نہیں کی اس کی تفصیلات کا یہاں مقام نہیں ہے لیکن جس طرح حضرت ابراہیمؑ کو آتش نمرود میں نہ پھینکا جاتا تو ان کے حلم وتوکل کا اندازہ ممکن نہ تھا اسی طرح عراق زیدی کی انتظامیہ صلاحیت اور علم کا اندازہ نہ ہوتا اگر انہیں یہ دبیری عطا نہ ہوتی۔ کچھ ناخوشگوار حالات کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن بڑی دلجمعی سے وہ کام کرتے رہے اور کر رہے ہیں ایسے بھی مواقع آئے کہ انہوں نے اپنی جیب سے کثیر رقم اس کے کاغذات کے احیا میں صرف کی اور تقاضا بھی نہیں کیا نہ انجمن کے بجٹ میں اسے ڈالا۔ اسی کا نام ہے تدیّن، لگن اور فارسی سے عشق۔

دوستوں، ساتھیوں اور شاگردوں کی مدد کرنے سے گریز نہیں کرتے، صاف اور کھرے انسان میں پسند اور ناپسند سب عیاں، حاضر جواب ہیں۔ ان کی یہ حاضر جوابی ہی ہے کہ وہ خود بھی فی البدیہہ گفتگو کرنے میں اور موقع موقع پر فی البدیہہ اشعار بھی پیش کر کے بزم کو رونق بخشتے ہیں۔ اگر خطابت بھی عطا ہوتی تو شہسوار میدان ہوتے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ خانہ فرہنگ دہلی نو میں پروفیسر رضیہ اکبر کی وفات پر

انجمن استادان فارسی کی طرف سے تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ اظہر صاحب کو ان کی اس خفیہ صلاحیت کا علم تھا بولے ''تاریخ نکالو'' زیدی صاحب نے فی البدیہہ درج ذیل تاریخ کہہ دی:

گویم این بزم غم و اندوه چیست؟
معتبر استاد ازین جا وای رفت
بشنو تاریخ وفاتش گفته ام
رضیه اکبر از جهان های رفت
۲۰۰۱ میلادی

اس وقت شکیب صاحب رایزن تھے خوش ہوئے اور کہا ''جدید می گویی''
ایسا ہی ایک واقعہ فریبا شیرازی کے ساتھ پیش آیا۔ علی گڑھ کے ایک سیمینار میں شریک تھیں زیدی صاحب سے جب انہیں متعارف کرایا گیا تو فی البدیہہ فرمایا:

چو من آن ترک شیرازی بدیدم
به شعر حافظ شیراز رقصم

دو ایک سال بعد وہ پھر علی گڑھ سیمینار میں آئیں ہم سب وہاں موجود تھے ان کی دور سے زیدی صاحب پر نظر پڑی قریب آئیں سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور بولیں مجھے پہچانا تم نے مجھ پر غزل لکھی تھی اور میں اسے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔
زیدی صاحب نے یہ تو نہ کہا کہ پہچان لیا فی البدیہہ شعر پڑھا:

فریبا! فراموش کردی چرا من
بیا سیر گلشن بکن یار بامن

ایسے مختلف واقعات سے ایک رسالہ مرتب کیا جا سکتا ہے اور کرنا چاہیے۔

سیمیناروں میں ہم ضرور شرکت کرتے ہیں مضمون لکھتے ہیں ملاقاتیں کرتے ہیں غم روزگار سے آزاد ایک کیف کا عالم ہوتا ہے۔

ایک سیمینار میں محترم حداد عادل صاحب اور فریبا صاحبہ دونوں شریک تھے۔ زیدی صاحب بھی وہاں موجود تھے جب اسٹیج پر تشریف لے جانے کے لیے آواز دی گئی تو فریبا نے برجستہ عرض کیا "**برای استاد حداد عادل شعر بگو**" یعنی استاد حداد عادل کے لیے شعر کہیے انہوں نے کھڑے کھڑے درج ذیل رباعی کہہ دی اور فن عروض کا ایک نمونہ اس طرح پیش کیا کہ اس رباعی کے مختلف مصرعے مختلف اوزان میں تھے۔ یہ صرف رباعی کے لیے ہے کہ ۲۴ اوزان میں سے کسی بھی مصرعے میں کوئی بھی وزن استعمال ہوسکتا ہے۔

یک دانشور، شاعر، عالم، فاضل
از آمد مختار و رئیس کامل
امروز شود هند زمین ایرانش
جشنی گیرم با حداد عادل

(اوزانِ رباعی)

مفعولن مفعولن مفعولن فع
مفعول مفاعیل مفاعیلن فع
مفعول مفاعیل مفاعیلن فع
مفعولن مفعولن مفعولن فع

یہ تو فارسی زبان وادب سے متعلق ان کی بدیہہ گوئی کے واقعات ہیں ناحق شناسی

ہوگی کہ اردو ادب سے متعلق کوئی بات نہ کی جائے زیدی صاحب فارسی، اردو اور ہندی کے شاعر ہیں۔ ہندی کے واقعات میرے علم میں نہیں ہیں لیکن اردو کے کئی واقعات بہت دلچسپ ہیں۔سیتھل کے رہنے والے ہیں درس وتدریس کی بنا پر آبائی وطن سے دور زندگی گذارنی پڑی ہے۔سیتھل پہونچے، بند مکان کا تالا کھولا ہوا کا ایک جھونکا آیا صحن میں گرے ہوئے خشک پتے ایسے اڑے جیسے ان کا استقبال کر رہے ہوں برجستہ ان کی زبان پر آیا:

مرے قدموں کا اب بھی لمس پا کر
مرا سنسان آنگن بولتا ہے

یہ ان کے دلی احساسات اور وطن سے وابستگی کی ایک جذباتی داستان ہے۔

اسی طرح ایک بار انبالہ میں ''قلم قبیلہ'' کی جانب سے ایک ہند و پاک مشاعرہ تھا جس میں احمد فراز اور یونس دہلوی وغیرہ شریک تھے مشاعرہ اپنے عروج پر تھا کہ پانی کا گلاس ٹوٹا،شیشہ کی جھنکار نے سامعین کی ذہنی مرکزیت کو منتشر کر دیا۔

زیدی صاحب نے وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے فی البدیہہ کہا:

جس بزم کی شوخ نگاہوں سے یہ شیشہ و جام تھے گردش میں
اس بزم کی گرم نگاہوں سے چھن سے یہ پیالے ٹوٹ گئے

ان کی اس بدیہہ گوئی سے ایسا محسوس ہوا کہ شیشہ کا ٹوٹنا بھی پروگرام کا حصہ تھا تالیاں بجنے لگیں،عوام جھومنے لگے۔

ان واقعات کو لکھنے کی ضرورت کیوں آن پڑی۔ یہ کتابچہ ''فارسی ادب میں بدیہہ گوئی کی روایت'' ساسانی بادشاہ بہرام گور سے شاہ عالم تک کے عہد مغلیہ پر مشتمل

ہے۔ایسا نہیں ہے کہ اس کے بعد کچھ نہیں ہوا ہوگا۔لیکن مواد کی فراہمی یونیورسٹی کی ذمہ داریوں کے ساتھ مشکل ہوجاتی ہے۔ان کے ذہن میں اسے آگے لے جانے کا ارادہ ہے اگر فرصت ملی اور وقت نے ساتھ دیا تو یقیناً ہمیں ایک دستاویز مل جائے گی ان شاء اللہ۔لیکن مشکلات بہت ہیں درباری سرپرستی ختم ہونے لگی دوسری زبانوں کے ہاتھ پاؤں پھیلنے لگے۔سیاستمداروں کی آنکھوں میں فارسی ادب کی شاہنشاہیت کانٹوں کی طرح چبھنے لگی ادب کا یہ شہنشاہ ایک مفلس شاہزادہ کی طرح ہندوستان کی سرزمین سے وابستہ زندگی گذار رہا ہے۔اس لئے مواد کی فراہمی آسان کام نہیں ہے۔پھر بھی زیدی صاحب کے حوصلے بلند ہیں انہوں نے نہ صرف یہ کہ واقعات کی جمع آوری تذکروں اور تاریخ کی کتابوں سے حاصل کی ہے بلکہ ناقدانہ بحث بھی کی ہے۔اپنے کثیر مطالعے کی بنا پر دقت نظری سے مذکورہ منابع میں تلاش کرکے ایک ایسا مسودہ پیش کیا ہے جس پر بالعموم علحیدہ کتاب یا رسالہ دستیاب نہیں اور اگر ہے تو عوام کی دسترس میں نہیں ہے۔تاریخ گوئی اور بدیہہ گوئی کے واقعات تاریخی آثار اور تذکروں میں بکھرے بکھرے نظر آتے ہیں۔یہ امر قابل ستایش ہے۔

یہ نوشتہ ہے، نہ تقریظ ہے نہ پیشگفتار۔آزاد ہندوستان کے کاروان ادب فارسی کے اس ہم سفر کا تعارف ہے جو اس عہد کا بدیہہ گو شاعر ہے اور ہندوستانی معاصر فارسی ادب کا اس فن میں فی الحال تنہا نمایندہ نظر آتا ہے ادھر ادھر اس عظیم ملک کے گوشوں میں اگر شعراء چھپے ہوں گے تو ان کا پتہ نہیں۔

میں نے مناسب سمجھا کہ ہندوستان کے معاصر بدیہہ گو شاعر سید عراق رضا کا تعارف بدیہہ گوئی کے آئینہ میں پیش کیا جائے، کیونکہ نہ اب تذکرے اس طرح لکھے

جاتے ہیں اور نہ تاریخ میں کوئی لکھے گا۔

کب لگاتا ہے کوئی اس دل بے حال کا مول
سب گھٹا دیتے ہیں مفلس کے غرض مال کا مول

مجھے یقین ہے ادبی حلقوں میں شاہزادہ فارسی کے کشکول میں یہ زیدی صاحب کا نذرانہ شرف قبولیت حاصل کرے گا۔

سیدہ بلقیس فاطمہ حسینی
نائب صدر، آل انڈیا پرشین ٹیچرس ایسوسی ایشن

فارسی میں بدیہہ گوئی کی روایت: پر ایک نظر

پروفیسر فاطمہ بیگم پروین
سابق صدر، شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

بہ یک نظر اصناف کا تعارف، آغاز وارتقا استناد کے ساتھ پیش کرنا کار دشوار ہوتا ہے۔اس کے لیے علم، مطالعہ، تفکر وتدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ زبان وادب پر کامل دستگاہ لازمی امر بن جاتا ہے۔ ہر نکتہ کو دلائل سے واضح کرنا کوئی آسان عمل نہیں ہوتا۔ سند اور دلیل کا وقیع ہونا بھی ایک اہم خصوصیت ہوتی ہے اور اتنی چیزوں کے یکجا کرنے کے لیے جس صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ایک باوقار شخصیت میں ہی پائی جاتی ہے۔ ''فارسی میں بدیہہ گوئی کی روایت'' کے مصنف پروفیسر عراق رضا زیدی میں یہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ جب میں نے اس کتاب کے مسودے کا مطالعہ کیا تو قدم قدم پر زیدی صاحب کے تبحر علمی کا اندازہ ہوا۔ ''بدیہہ گوئی'' کے بارے میں انہوں نے بڑے ہی معروضی انداز میں اظہار خیال کیا ہے اور ہر ممکن زاویہ سے اس کو واضح کیا ہے مثالیں دی

ہیں۔اس کے بعد بتدریج اس کے آغاز و ارتقا اور اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور ہر مرحلہ پر فارسی کے مشہور شعرا کے کلام سے نہ صرف مثالیں پیش کی ہیں بلکہ موقع و محل کے بارے میں بھی تفصیلی طور پر معلومات کا اظہار کیا ہے۔

شاعری جذبات و احساسات کی پیش کشی کا ذریعہ ہے۔غور و فکر اور تجزیہ و تجربہ اس میں بہترین اسلوب اور انداز کو شامل کرتا ہے لیکن بدیہہ گوئی میں خداداد صلاحیت، زبان پر عبور، لفظوں پر گرفت، اختراعی ذہن اور ذہانت، ذکاوت کا عمل دخل لازمی ہوتا ہے۔ شاعروں میں بدیہہ گو نسبتاً کم ہی ہوتے ہیں۔موڈ، مزاج، موقع، بطیعت میں آمد، مختلف لوازمات کے بعد ہی اچھا شعر اور اچھی شاعری کی توقع کی جاتی ہے لیکن غیر معمولی شخصیات ہر چیز سے ماورئی ہوتی ہیں۔

''فارسی میں بدیہہ گوئی کی روایت'' میں پروفیسر عراق رضا زیدی نے انسان کی پیدائش سے بات شروع کی ہے اور ذہن کو مختلف اور متعدد اقسام کے انسانوں سے متعارف کراتے ہوئے لفظ بدیہہ اور اس کے معنی و مفہوم سے روشناس کیا ہے۔لغوی اور اصطلاحی معنوں کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے عربی اور فارسی ادب کے رشتوں کو اجاگر کیا ہے۔عربی میں بدیہہ گوئی کے لافانی نمونے پیش کیے ہیں، یہ کام آسان نہیں ہے۔ اس سے زیدی صاحب کے عمیق مطالعے اور وسیع معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔عربی اشعار، اردو ترجمے، موقع و محل کی تفصیل پڑھنے والے کو پس منظر، منظر اور اشعار، موضوع، طرز اظہار سب سے قریب کر دیتی ہے اور جو سینکڑوں برس قدیم اور یہ بہترین نثر نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔

فارسی میں اس کی ابتدا کے بارے میں تاریخی، ادبی معلومات کے توسط سے نہایت ہی وضاحت کے ساتھ بدیہہ گوئی کی مثالیں قبل از اسلام دور سے پتھروں اور کتبوں

پر موجود نقوش کے ذریعہ اجاگر کی گئی ہیں۔ اردو، فارسی تحریروں سے سندیں دیتے ہوئے اپنی پیشکش کو استناد عطا کیا ہے۔ حکایتیں، حقایق، تاریخی، ادبی ماخذ سے مدد لیتے ہوئے یہ سلسلہ دراز کیا ہے۔

فارسی بدیہہ گوئی کا یہ سفر ایران سے دور طاہریہ، دور صفاریہ، دور سامانی سے شروع ہوتا ہے رودکی اس دور کا اہم بزرگ ترین اور فارسی ادب کا بابا آدم کہلایا جانے والا شاعر ہے۔ رودکی کی بدیہہ گوئی کے کئی واقعے درج ہیں۔ مصنف نے اس میں سے ایک واقعہ کا انتخاب کرتے ہوئے اسے شامل کیا ہے۔

سامانی دور کے بعد غزنوی دور پر روشنی ڈالی گئی ہے مثالوں سے وقیع بنایا گیا ہے۔

ہندوستان میں بھی غزنوی دور سے ہی شاعری کے آغاز کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے شہاب الدین غوری اور خاندان غلامان کا ذکر کرتے ہوئے امیر خسرو اور ان کی بدیہہ گوئی کے بارے میں مثالوں کے ساتھ بتایا گیا ہے۔

ایران اور ہندوستان پر دو مقامات کے اہم شعرا کی اس خاصیت پر حوالوں اور مثالوں کے ساتھ اظہار خیال کرتے ہوئے بابر، ہمایوں، اکبر اور اکبر کی شعر فہمی، سخن سنجی، برجستگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اکبر کے درباری شاعر اور ملک الشعرا فیضی کی بدیہہ گوئی کے بارے میں بھی تفصیلی ذکر ملتا ہے۔

جہانگیر اور نور جہاں، طالب آملی جو دربار جہانگیر کا ملک الشعرا تھا کے بارے میں بتاتے ہوئے اپنی بات آگے بڑھائی ہے۔ شاہ جہاں اور اس کے ملک الشعرا ابوطالب کلیم، صائب وغیرہ کی صلاحیتوں کا بیان ملتا ہے۔

اورنگ زیب کے عہد کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے اس صنف

کے ارتقا پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

پروفیسر عراق رضا زیدی کسی بھی موضوع پر سبک کام نہیں کرتے۔ ان کا ہر کام گہرائی، گیرائی، علمیت اور استناد کا حامل ہوتا ہے۔ بات کی تہہ تک پہنچنا، دلائل سے اسے علمی وقار عطا کرنا، مثالوں سے اسے قابل قبول بنانا، اپنی بات معروضی انداز میں پیش کرنا ان کا خاصہ ہے۔ وہ خود ایک بدیہہ گو شاعر ہیں۔ چلتے پھرتے برموقع و برمحل اشعار موزوں کر دیتے ہیں۔ خوش خلقی، خندہ پیشانی، بزلہ سنجی نے ان کی شخصیت کو ایک خاص انفرادیت عطا کی ہے۔ ہنستا مسکراتا یہ پیکر، علمی میدان میں بڑا آہنی انداز اختیار کر لیتا ہے۔ موضوع کو کچھ اس طرح پر پیش کرتے ہیں کہ اسے سوائے تسلیم کرنے کے کوئی چارہ ہی باقی نہیں رہ پاتا۔ امثال، دلائل، ثبوت، شواہد اور سب سے زیادہ اہم ان کی محنت، مشقت، تلاش و جستجو اسے قبول کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ بدیہہ گوئی کو انہوں نے بڑی فن کاری سے اپنی ابتدا سے عہد مغلیہ تک اجاگر کیا ہے ان کے علمی مطالعہ سے انکار ممکن نہیں۔ اس گراں بہا کاوش پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتے ہوئے رخصت ہوتی ہوں۔

والسلام

فاطمہ بیگم پروین

قرآن کی رو سے تخلیق انسان

خدا نے تخلیق انسان کے ساتھ ہی ہر انسان کو جداگانہ صفات کا حامل بنایا۔ ہر انسان کو ایک الگ شناخت عطا کی۔اس کی اسی پہچان کو قائم رکھنے کے لئے کلام مجید میں فرمایا:

"یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ ذَکَرٍوّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًاوَّ قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ". (۱)

اے لوگوں ہم نے تمہیں ایک آدمی (جنابِ آدمؑ) اور ایک عورت (جنابِ حوّاؑ) سے پیدا کیا اور تمہیں شاخوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا تاکہ تمہاری پہچان رہے، بیشک صاحبان تقوی ہی خدا کے نزدیک مکرم ہیں، بے شک خدا سب کچھ جانتا ہے ہر چیز سے باخبر ہے۔

دانشوران کی طبقہ بندی:

انسان کی اس پہچان میں چالاک ، شجاع و بہادر، ڈرپوک ،دانشور، عقلمند اور بدھو بھی آتے ہیں۔دنیا کا دارومدار انہیں شناختوں اور جداگانہ خصوصیات کے حامل

انسانوں پر ہے مثلاً دنیا میں رہنے کے لئے جھاڑو دینے اور مزدوری کرنے والوں کی بھی ضرورت ہے ۔کلرکوں اور معماروں کی ضرورت بھی ہے۔ساتھ میں وکیلوں، ڈاکٹروں انجینئروں اور سائنسدانوں کے کارنامے بھی چاہیے۔طبیبوں، دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کا ہونا بھی لازمی ہے۔انہیں ادیبوں اور شاعروں میں بھی اچھی خاصی طبقہ بندی نظر آتی ہے مثلاً کچھ شاعر اپنے کلام اور جدت کی بنا پر صفِ اوّل میں شمار کئے جاتے ہیں، کچھ صف دوم میں آتے ہیں اس طرح لاکھوں شاعر فقط بطور گنتی کے شمار کر لئے جاتے ہیں۔یہی حال ادیبوں کا بھی ہے کچھ انسانوں کو بات چیت کا ایک خاص سلیقہ عطا کیا جاتا ہے کچھ نہایت بھونڈی گفتگو کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کی کوئی شناخت نہیں ہوتی ۔البتہ حاضر جواب، دماغ کو بروے کار لانے والے ہمیشہ سماج میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔بات نثر میں کہی جائے یا نظم میں اس کی اہمیت سماج پر ہونے والے اثرات پر مضمر ہوتی ہے۔جو لوگ نہایت حاضر جواب اور موقع ومحل کے حساب سے بات کرتے ہیں انہیں سے اہل بستی یا اہل شہر مشورے بھی لیا کرتے ہیں۔

بدیہہ گوئی: معنی وتشریح

جس طرح نثر میں حاضر جوابی کا جلوہ رہا ہے اسی طرح حسبِ محل یا حسب واقع فوراً شعر کہہ دینا بھی بدیہہ گوئی یا فی البدیہہ کی روایت میں آتا ہے۔فیروز اللغات میں جس کے معنی اس طرح درج ہیں۔

> ”بدیہہ کے معنی: سوچی بات، نرالی اور بے سوچی بات وہ کھلی اور ظاہر
> بات جو دلیل یا ثبوت کی محتاج نہ ہو“(۲)

فرہنگ آصفیہ میں بھی کچھ فرق کے ساتھ یہی معنی بیان ہوئے ہیں:

''اسم مذکر بلا تامل بے سوچے کوئی ٹھیک بات کہنا برجستہ بدیہی
صفت وہ بات جس کی دلیل کی حاجت نہ ہو ظاہر صریح عیاں
روشن المنشرح''(۳)

بدیہہ گوئی کو ہی فی البدیہہ بھی کہا جاتا ہے جس کے معنٰی صاحبِ فیروز اللغات نے اس طرح درج کیے ہیں:

''فوراً۔فوراً۔ برمحل جواب دینا''(۴)

اور فرہنگ آصفیہ میں اس کے معنی اس طرح درج ہیں:

'بے سوچے، فی الفور، فوراً ترت، برمحل کوئی شعر یا کہاوت وغیرہ کہنا'۔(۵)

لغوی معنٰی کے علاوہ اکثر الفاظ کے دوسرے مشہور اور عوامی استعمال میں آنے والے معنٰی کی اہمیت بھی کم نہیں ہوتی خصوصاً صنف شعر یا اس طرح کے دوسرے عوامل میں لغوی معنٰی سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ کے لغوی معنیٰ کچھ ہیں لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔اس طرح فی البدیہہ جیسے الفاظ اصناف سخن میں داخل ہونا چاہیے تھے لیکن ادباء کی نظر اس طرف نہ جانے کی بنا پر لفظ اور صنف اپنی اصل منزل سے دور رہی۔اس لیے انواع شعر یا بحر الفصاحت وغیرہ کتابوں میں اس صنف کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ دراصل بدیہہ گوئی سے مراد ہے کسی خاص واقعے کی نوعیت پر اس واقعے کے دوران ہی برمحل ایک ایسا شعر، قطعہ یا رباعی فوراً موزوں کر دینا جس کا اثر اس واقعے میں شامل یا اس سے متعلق لوگوں کے ذہن و دل پر فوراً اثر کرے اس میں کسی سوال کا جواب بھی ہوسکتا ہے اور طنز و مزاح کی کیفیت بھی طاری ہوسکتی ہے۔مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ بدیہہ گوئی کا مطلب ہے کہ فوری شعر کا موزوں کرنا یا کسی جملے پر جوابی مگر چبھتے ہوئے نشتر کی طرح کام کرنے والے جملے کا فوری ادا کرنا۔

بدیہہ گوئی کے لیے حاضر دماغی اور وسیع وعمیق مطالعہ درکار ہوتا ہے ساتھ ہی بروئے کار لانے والے الفاظ کے تاریخی، محاوراتی، عوامی اور لسانی اثرات سے اچھی طرح واقفیت ہونی چاہیے۔

عربی زبان سے مثالیں:

(الف) حضرت ابوطالبؑ کی نعت

فارسی ادب میں دیگر اصناف سخن کی طرح بدیہہ گوئی کی روایت بھی عربی زبان کی مرہونِ منت ہے۔ عربی زبان میں فی البدیہہ اشعار کے استعمال نے اکثر تاریخی اور روایتی پس منظر کا احاطہ کیا ہے یہاں صرف دو مثالوں کے ذریعے مضمون کو آگے بڑھانے کی سعی کی جارہی ہے جہاں رسول خدا کے چچا اور مولا علیؑ کے والد حضرت ابوطالبؑ کی بد یہہ گوئی اور اس کے اثرات کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

ایک مرتبہ پیغمبرؐ خدا نے بازار ذوالمجاز سے گزرتے ہوئے لوگوں کو خدا کے دین کی طرف دعوت دی اور فرمایا:

"قولوا لااله الاالله تفلحوا" (٦)

یہاں ابولہب اور جناب عباس بھی موجود تھے۔ ابولہب نے پکار کر کہا لوگوں ان کی بات مت سنو (معاذ اللہ ہمارا بھتیجا جھوٹا ہے) حضرت ابوطالبؑ نے اس کی بات سنی اور اس کو مخاطب کر کے فرمایا خدا تجھے غارت کرے۔ خدا کی قسم محمد صادق القول ہیں۔ اس کے بعد فی البدیہہ یہ چند اشعار پڑھے۔

دعوتنی و علمت انک صادق

و لقد صدقت و کنت ثم امیناً

اے محمدؐ تم نے مجھے دین اسلام کی طرف بلایا اور میں نے سمجھ لیا کہ درحقیقت تم صادق القول، راست باز اور امانت دار ہو۔

ولقد علمت بان دین محمدؐ

من خیر ادیان البریہ دینا

اور بیشک مجھے یقین ہوگیا کہ دین محمدیؐ دنیا کے تمام دینوں سے بہتر ہے۔

واللہ لن یصلوا الیکم یجمعھم

حتی اوسد فی التراب دفینا(۷)

خدا کی قسم جب تک میں زندہ ہوں قریش میں سے کوئی شخص تمہارا کچھ نہیں کرسکتا۔

الم تعلموا انا وجدنا محمداً

نبیاً کموسیٰ خُط فی اول الکتب

کیا تم نہیں جانتے ہم نے محمدؐ کو موسیٰ کی طرح رسول پایا ہے اور ان کا نام پہلی آسمانی کتابوں میں مرقوم ہے۔

و ان علیہ فی العباد محبۃ

ولا خیر ممن خصہ اللہ بالحب

مخلوق خدا کو ان سے ایک خاص محبت ہے اور جس کی محبت خدا نے لوگوں کے دلوں میں ودیعت کی ہے اس پر ستم روا نہیں کیا جاسکتا۔

انت الامین امین اللہ لا کذب

والصادق القول لا لھو ولا لعب

آپ اللہ کے امین ہیں اس میں کوئی بات جھوٹ نہیں ہے آپ صادق القول ہیں آپ کا لایا

ہوا دین بچوں کا کھیل نہیں ہے ایک ٹھوس حقیقت ہے۔

انت الرسولؐ، رسول اللہ نعلمہ

علیک نزل من ذی العزۃ الکتب" (۸)

بے شک اے رسولؐ ہم جانتے ہیں کہ آپ جہاں کے رسول ہیں اور رب العزت کی طرف سے آپ پر کتاب نازل ہوئی ہے۔

ظاہر ہے فی البدیہہ ان اشعار کے ذریعے ہی نعت کہنے کے سلیقے کا چلن عام ہوا۔ گویا یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کے فی البدیہہ کہے ہوئے ان اشعار نے جہاں ابولہب کے حوصلوں کو پست کیا وہیں فی البدیہہ جواب کے ذریعے وہاں پر موجود لوگوں کو رسولؐ خدا کی اہمیت کا احساس بھی دلایا۔ اور حضورؐ کو سچا اور صادق، خدا کا رسول ثابت کر کے عربی زبان میں ایک نئی صنف ''**نعت**'' کا راستہ ہموار کیا ہے ۔جن کی تاسی میں عربی پھر فارسی اور اب اردو ہی کیا دنیا کی ہر زبان میں نعت گوئی کا چلن عام ہوا۔

(ب) امام زین العابدینؑ اور قصیدۂ فرزدق

اسی طرح ایک دوسری مثال عربی کے ہی ایک شاعر فرزدق کی ہے۔ جسے ''**حلیة الاولیاء**'' میں ابونعیم نے اس طرح تحریر کیا ہے۔

''قال حَجَّ ھشام بن عبدالملک فی ایام ابیه فطاف و جھد اَن یَصل الی الحجر لیستلمه فلم یقدر علیه لکثرۃ الزحام فنصب له منبر و جلس علیه ینظر الی

الـناس وحوله جماعة من اعيان اهل الشام فبينما هو
كـذلك اِذ اَقْبَـل زيـن العابدين علىؑ بن الحسين بن
عـلىؑ فـلـمـا انتهـى الى الحجر تنحىٰ له الناس حتى
استـلـم فـقـال رجل من اهل الشام. من هذا الذى قد
هـابه الناس هذه الهيبة فقال هشام لا اعرفه مخافة ان
يـر غـب فيـه اهـل الشـام فيـمـلكوه وكان الفرزدق
حاضراً فقال انا اعرفه فقال''. (۹)

ترجمہ: کہتے ہیں کہ جب ہشام بن عبدالملک اپنے باپ کے زمانۂ سلطنت میں حج کے لئے آیا اور ہنگامِ طواف اس نے حجراسود کو بوسہ دینے کا قصد کیا تو لوگوں کی بھیڑ کی وجہ سے بہت کوشش کی پھر بھی حجراسود تک نہیں پہنچ سکا۔ مجبوراً ایک طرف منبر پر بیٹھ کر مجمع کا تماشہ دیکھنے لگا اور منبر کے گرد سرداران شام نے حلقہ کرلیا تاکہ ہشام کی سطوت شاہزادگی سب پر ظاہر ہوتی رہے۔ اتنے میں امام زین العابدین علی بن الحسینؑ طواف کے لئے تشریف لائے اور انھوں نے حجراسود کی جانب رخ کیا تو لوگ فوراً ادھر ادھر ہٹ گئے اور امام زین العابدینؑ نے بلا کسی روک ٹوک کے حجراسود تک پہنچ کر شرط اسلام ادا کیا۔ شام کے لوگوں میں سے ایک شخص نے ہشام سے دریافت کیا کہ یہ کون شخص ہے جس کی ہیبت سے لوگ ہٹ گئے ہشام نے اس خوف سے کہ کہیں ایسا نا ہو کہ اہل شام کی میلان علیؑ بن حسینؑ کی امامت وخلافت کی جانب ہو جائے کہا کہ میں اس شخص کو نہیں پہچانتا۔ اتفاقاً اس مجمع میں فرزدق شاعر بھی موجود تھا۔ ہشام کا تجاہل عارفانہ دیکھ کر فرزدق سے رہا نہ گیا اور اس نے شامیوں کی

طرف مخاطب ہو کر کہا کہ اس شخص کو میں جانتا ہوں مجھ سے سنو کہ یہ کون ہے۔ (اس کے بعد اس نے ایک فی البدیہہ قصیدہ کہہ کر سنایا) اس قصیدے کے چند اشعار بطور نمونہ نقل کیے جا رہے ہیں:

ھذا الذی تعرف البطحا وطاتہ

والبیت یعرفہ والحل و الحرم

یہ وہ شخص ہے جس کو خانۂ کعبہ اور حل وحرم سب پہچانتے ہیں۔ اور جس کے قدم رکھنے کی وجہ کو زمین بھی محسوس کر لیتی ہے۔

ھذا ابن خیر عباد اللہ کلھم

ھذا التقی النقی الطاھر العلم

یہ شخص اس کا فرزند ہے جو تمام بندگان خدا سے افضل مانا جاتا ہے اور یہ شخص خود بھی پرہیز گار پاک سرشت اور سردار قوم ہے۔

ھذا ابن فاطمۃ الزھرا ان کنت جاھلہ

بجدہ انبیاء اللہ قد خُتم

اگر تو اس کو نہیں جانتا تو سن لے یہ فاطمہ زہراؑ کا فرزند ہے۔ اس کے جد بزرگوار پر تمام نبیوں کا خاتمہ ہوا ہے۔

یبین نور الدجی عن نور طلعتہ

کالشمس ینجاب عن اشراقھا الظلم

اس کی پیشانی کی چمک سے ظلمتیں دور ہوتی ہیں۔ جیسے کہ آفتاب کے طلوع ہونے سے اندھیرا ختم ہو جاتا ہے۔

یُغضی حیاءً و یُغضیٰ مھابۃ

فــــمـــــا یـــكــــلـــم الا حیـــن یبتســـم

شرم و حیا کے باعث آنکھوں کو نیچی رکھتا ہے اور لوگ اس کی ہیبت سے آنکھیں نیچی رکھتے ہیں۔ لوگ اس سے اس وقت بات کرتے ہیں جب یہ مسکراتا ہو۔

اذا رَاَتَـــه قـــریـــش قـــال قـــائـلهـــا

الـــی مـــكـــارم هـــذا یـــنتهـــی الـكـــرم

جس وقت قبیلہ قریش ان کو دیکھتا ہے تو کہنے والا کہتا ہے کہ تمام جود و سخاوت اور خصائل حمیدہ کا اسی پر خاتمہ ہے۔

یـــنـــمـــی الـــی ذروـــة الـــعـــز التـــی قـــصـــرت

عـــن نیـــلهـــا عـــرب الاســـلام والـــعـــجـــم

یہ عزت و احترام کی اس معراج پر فائز ہے جہاں عرب و عجم کے مسلمان پہنچنے سے قاصر ہیں۔

مـــن جـــده و ان فـــضـــل الانبیـــاء لـــه

و فـــضـــل امتـــه و انـــت لـــه الامـــم

اس کا جد امجد وہ ہے جس کی عظمت و رفعت تمام انبیاء سے فزوں تر ہے۔ اور اس کی امت کا مرتبہ امتوں سے بڑھکر ہے حالانکہ تو بھی اسی امت کا ایک فرد ہے۔

یـــكـــاد یـــمســـكـــه عـــرفـــان راحتـــه

ركـــن الـــحـــطیـــم اذا مـــا جـــاء یستـــلـــم

قریب ہے کہ اس کے ہاتھ کی خوشبو کو رکن حطیم یعنی حجر اسود چوم لے۔ جبکہ وہ خود اس کے چومنے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔

فـــی كـــفـــه خیـــزران ریـــحـــه عبـــق

مــن کــفـــه اَروَع فـــی عـــرنینـــه شـمـم

اس کے دست مبارک میں مشک کی چھڑی ہے جس کی خوشبو نہایت خوشگوار ہے۔اس کے ہتھیلی سے خوشبو بلند ہو کر سب کے مشام میں پہنچ رہی ہے۔

سهـــل الـــخـــلـيـقة لا یـــخـــفـــی بـــوادره

یــزیــنـــه اثـــنـــان حسـن الـخـلـق والشـمـم

یہ نرم خو ہے اس کی خصلتیں پوشیدہ نہیں ہیں۔اس کو دو چیزوں نے زینت دی ہے ایک تو عمدہ خو اور خوش خلقی۔

مشتـــقة عـــن رســـول الـــلـــه بـــنـعتـــه

طـــابـــت عـــنـــاصـــره والـخـیـم والشیـم

اس کی صفات رسول اکرمؐ سے مشتق ہیں۔اس کی خو، عناصر اور عمدہ خصائل بہت خوبصورت ہیں۔

فـــلـیـــــس قـــولک مـــن هـــذا بـــضـــائـــرة

الـعـــرب تـعـــرف مـــن انـــکـــرت والـعـجـم

پس تیرا یہ کہنا کہ میں ان کو نہیں جانتا ان کو نقصان پہنچانے والا نہیں ہے۔عرب وعجم اس کو خوب جانتا ہے جس کا تو نے انکار کیا ہے۔

کِـــلْتَـــا یـــدیـــه غیـــاث عـــم نـفعهـمـــا

تستـــوکـــفـــان ولا یـعـــروهـــمـــا الـعـدم

اس کے دونوں ہاتھ مسلسل جود وسخاوت سے عوام کو مستفیض کر رہے ہیں۔اور مال و دولت کا نہ ہونا ان کو کبھی خالی نہیں کرتا۔

عم البریہ بالاحسان فانقشعت

عنہا الغبایۃ والاملاق والظلم

مخلوقات پر ان کا احسان عام ہے۔لہٰذا مخلوق سے ظلم، گمراہی وتنگدستی دور ہوگئی۔

لا یستطیع جواد بعد غایتہ

ولا ینادیھم قوم و ان کرم

کوئی جوانمرد سخی ان کی سخاوت کا مقابل نہیں ہوسکتا۔اور کوئی بھی قوم ان کے ہم پلہ نہیں ہو سکتی چاہے وہ کتنے ہی سخی کیوں نہ ہوں۔

اللہُ فضّلہ کرماً و شرفاً

جری بذالک لہ فی اللوح والقلم

پروردگار عالم نے اپنے فضل وکرم سے ان کو بزرگی وسیادت عطا کی ہے۔لوح وقلم میں بھی انہیں کی وجہ سے حکم جاری ہوتا ہے۔ (۱۰)

بدیہہ گوئی درنثر:

عربی سے ہی ''بدیہہ گوئی'' کی یہ روایت فارسی میں درآئی جہاں اس روایت کو شاعری نے پروان چڑھنے کا پورا موقع فراہم کیا وہیں نثر میں بھی ترکی بہ ترکی جواب دینا بھی فی البدیہہ روایت کا ایک حصہ ہے جہاں مثال کے طور پر صرف دو واقعے دور مغولان کے بیان کئے جاتے ہیں جن میں ایک دور اکبری پر مشتمل ہے تو دوسرے کا تعلق شاہ جہاں کے زمانے سے ہے۔

اکبر کا دور فارسی زبان خصوصاً فارسی شاعری کا عہد زریں گردانا جاتا ہے اس دور میں ایران اور وسط ایشیا سے شعراء وادبا ہندوستان میں کھنچے چلے آرہے تھے۔ دربار میں بھی شاعروں کی کثرت تھی۔ ابوالفضل نے ''آئین اکبری'' میں درباری شاعروں کی تعداد لکھی ہے اور اس کے علاوہ محتشم کاشی جیسے شعراء کا ذکر الگ سے کیا ہے۔ اس نے ملک الشعراء کا ایک خاص عہدہ بھی قائم کیا جس پر سب سے پہلے غزالی مشہدی سرفراز ہوا۔ اس کے انتقال کے بعد اس ملک الشعرائی کا سہرا فیضی کے سر بندھا۔ اکبری دور میں سب سے زیادہ شہرت پانے والے صرف تین شاعر نظر آتے ہیں جن کا دبدبہ آج تک بنا ہوا ہے۔ یہ ہیں عرفی شیرازی، نظیری نیشاپوری اور فیضی ان میں عرفی اپنی نخوت کی بنا پر زیادہ معروف رہا۔ لیکن فیضی کا شمار اکبر کے نورتنوں میں کیا جاتا ہے۔ جس کے دربار سے بھی اکثر شعرا منسلک رہتے تھے لیکن ادب پروری کا خاص اہتمام عبدالرحیم خان خانان سے وابستہ تھا۔ یہاں فیضی اور عرفی سے متعلق ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔

فیضی و عرفی کا واقعہ:

" آورده اند که روزی به دیدن شیخ فیضی مبارک رفته بود. شیخ باسگ بچگان انس بسیار داشت، چنانکه در مجلس با قلا دهای زر و زیور مرصع، لابه کنان با شیخ می جوشیدند. عرفی این معنی تماشا کرده پرسید."

"صاحبزاده ها چه نام دارند"

شیخ روی درهم کشیده گفت:

"عرفی نام نهاده ام"

عرفی بدیهة گفت که :

ان شاء الله مبارک باشند!"

شیخ منفعل شده هیچ نگفت." (١١)

فیضی کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا ایک دن عرفی ان سے ملنے گیا تو وہ کتوں سے کھیل رہا تھا۔ جو قیمتی پٹوں سے آراستہ تھے۔ عرفی نے مزاحاً دریافت کیا کہ ان بچوں کا کیا نام ہے۔ یہ بات فیضی کو ناگوار گذری اس نے جواباً کہا "عام سا نام رکھ دیا ہے۔ یعنی "عرفی" عرفی نے فی البدیہہ جواب دیا۔

ان شاء الله مبارک باشند

شیخ مبارک فیضی کے والد کا نام تھا۔ جس سے عرفی نے فائدہ اٹھا کر فیضی کو شرمندہ کر دیا۔

جہاں آرا بیگم اور سعید اشرف مازندرانی کا واقعہ:

اسی طرح کا ایک واقعہ جہاں آرا بیگم اور سعید اشرف مازندرانی کے درمیان بھی بیان کیا جاتا ہے۔ جہاں آرا بیگم خوبصورتی کے ساتھ ساتھ نہایت ذہین اور برجستگی میں طاق تھی۔

سعید اشرف ایک دن جہاں آرا بیگم کے یہاں تشریف لے گئے۔ اور جہاں آرا بیگم کو چڑھانے کے لئے اسی کی فرمائش پر جب اس نے خاطر تواضع کے لئے دریافت کیا کہ آپ کیا نوش فرمانا چاہیں گے۔

سعید اشرف نے جواب دیا۔'سنبوسۂ بی سن'
اس جملے کے دو مطلب نکلتے ہیں:
۱۔چنے کے پسے ہوئے آٹے کا سنبوسہ جسے بیسن کہا جاتا ہے یعنی بیسن کا سنبوسہ۔
۲۔وہ سنبوسہ جس میں ''سن'' نہ ہو یعنی بی ''سن'' کا جس سے مراد بوسہ ہوتا ہے۔ جہاں آرا بیگم نہایت حسین وخوبصورت تھی ہی۔ لیکن حاضر جوابی میں بھی طاق تھی لہٰذا وہ سمجھ گئی کہ مولانا کی مراد ''بوسے'' سے بھی ہے۔ اس نے فوراً جواب دیا۔
''در مطبخ مادر یاب''
اس جملے کے بھی دو معنی نکلتے ہیں۔
۱۔در مطبخ ما، در یاب
ہمارے باورچی خانے سے حاصل کر لو۔
۲۔در مطبخ مادر، یاب (۱۲)
اپنی ماں کے باورچی خانے سے لے لو۔
سعید اشرف مازندرانی نہایت شرمندہ ہوئے۔

یزدگرد سوم اور جنگ قادسیہ کے نتائج:

فارسی شاعری میں بدیہہ گوئی کی روایت کے نقوش ابتدائے شعر گوئی سے ہی نظر آتے ہیں۔ ''جنگ پُل''، ''جنگ قادسیہ'' اور ''جنگ نہاوند'' ایرانیوں کی شکست اور آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد سوم کے قتل کے بعد ایران عربوں کے تخت وتاز کا میدان بن گیا یہاں تک کہ عربوں نے ایرانیوں کو خوب ذلیل وخوار کیا اور ان پر اپنے تمام لوازمات تھوپ دئے۔ یہاں تک کہ دو سو سال کے طویل عرصے میں فارسی زبان وادب کی کوئی تحریر نظر نہیں

آتی ہے۔ایرانی اس شکست کا بدلہ لینے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔

امین رشید، مامون رشید اور ذوالیمینین :

انہیں دوبارہ یہ مواقع ہاتھ بھی آئے۔ایک جب عباسیوں نے امویوں پر فتح حاصل کی تو اس فتح کو ہمکنار کرنے میں ابومسلم خراسانی کا اہم کردار تھا لیکن سفاح اور منصور دوانقی نے حکومت حاصل کرنے کے بعد اسے سر دربار ذلیل کر کے قتل کر دیا۔جس کے بعد ایرانی زخمی شیر کی طرح موقع کا انتظار کرنے لگے۔آخر کار ہارون رشید کے بیٹوں میں جنگ چھڑی تو امین رشید جس کی ماں عربی ہونے کے بنا پر عربوں نے اس کا ساتھ دیا۔مامون رشید کی ماں ایرانی تھی اور اسے ایران ہی کے ایک حصے خراسان کی حکومت دی گئی تھی۔مگر جب امین رشید نے اپنے بھائی مامون رشید پر حملہ کیا تو ایرانی مامون کے ساتھ تھے یہاں تک کہ طاہر ذوالیمینین نے امین رشید کو صرف شکست ہی نہیں دی بلکہ برسوں کا حساب کتاب چکاتے ہوئے مامون رشید کی مرضی کے خلاف امین رشید کو دریائے دجلہ میں قتل کر دیا۔مامون رشید نے بطور انعام طاہر ذوالیمینین کو خراسان کی امارت بخش دی اور یہیں سے ۲۰۵ھ میں ایرانیوں کو دوبارہ حکومت کا مزہ چکھنے کا موقع ملا اور فارسی زبان کا ارتقاواحیا دوبارہ ہونے لگا۔

فارسی زبان کا احیا:

فارسی شاعری یوں تو 'طاہر یہ دور' میں ہی شروع ہو چکی تھی لیکن دور طاہر یہ اور دوسرے 'دور صفاریۂ' میں کوئی خاص پیش رفت نظر نہیں آتی البتہ تیسرا دور جو 'سامانی عہد

' کے نام سے مشہور ہے اس میں باقاعدہ فارسی شاعری کے نقوش ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جہاں 'ابوشکور بلخی' مثنوی جیسی صنف سخن ایجاد کر کے رباعی اور غزلیں کہتا نظر آتا ہے تو 'دقیقی طوسی' ''شاہ نامہ'' کی ابتدا کرتے ہوئے ایک ہزار اشعار پر مبنی اپنی یادگار مثنوی چھوڑتا ہے جو آج بھی 'شاہنامہ فردوسی' کا حصہ ہے۔لیکن سامانی دور ''رودکی سمرقندی'' کے نام سے جانا جاتا ہے، جسے فارسی شاعری کا بابا آدم تسلیم کیا گیا ہے اس نے فارسی زبان کو صنف رباعی کا تحفہ اس طرح عطا کیا کہ اس صنف سے عربی زبان بھی خالی تھی اور یہ فارسی کی اپنی صنف سخن بن کر ایک باوقار صنف سخن کی شکل میں ابھرتی رہی۔

فارسی میں بدیہہ گوئی کی ابتدا بہرام گور نے کی:

اس دور میں بدیہہ گوئی کا حال بیان کرنے سے قبل فارسی باستان میں بھی بدیہہ گوئی کی ایک مثال پیش کرنا بہتر ہوگا یوں تو قبل از اسلام کا فارسی ادب مفقود ہو چکا ہے۔ لیکن پتھروں اور کتبوں کی شکل میں جہاں تہاں چند اشعار مل جاتے ہیں۔اسی ذیل میں ذبیح اللہ صفا اپنی کتاب ''تاریخ ادبیات در ایران'' میں فارسی شاعری کی تاریخ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اول کسی کہ شعر پارسی گفت بهرام گور بود. در آن وقت که ازملک مرویرا انز عاجی افتاد از راه ضرورت ببادیه رفت و نشو و نماءِ او در میان اعراب اتفاق افتاد و بر دقایق لغت عرب واقف و عارف گشت. و اورا شعر تازیست بغایت بلیغ و اشعار او مدون است و بنده در کتا ب خانه سرپل

بازارچہ بخارا دیوان او دیدہ است و در مطالعہ در آوردہ است و از آنجا اشعار نوشتہ و یاد گرفتہ. وقتی آن پادشاہ در مقام نشاط و موقف انبساط این چند کلمہ موزون بلفظ راند:

منم آن شیر گلہ منم آن پیل یلہ

نام من بھرام گور کنیتم بو جبلہ

پس اول کسی کہ سخن پارسی را منظوم گفت او بود". (۱۳)

دراصل اسی پہلے شعر کے ساتھ ہی فارسی میں بدیہہ گوئی کا آغاز بھی ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ مولانا محمد حسین آزاد نے اس شعر کہنے کی وجہ "**سخندان فارس**" میں اس طرح بیان کی ہے:

"فارسی کے مورخ اور تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ اسلام سے پہلے ملک فارس میں شاعری نہ تھی۔ بہرام گور ایک دن شکار کو نکلا ایک بن میں گھس کر شیر کو جیتا پکڑ لایا اور اسطرح زیر کیا کہ دونوں کان کھینچ کر گرہ لگا دی جوش تفاخر میں اس کی زبان سے نکلا:

"**منم آن پیل دمان و منم آن شیر یلہ**"

اس کی ایک معشوقہ تھی کہ حسن و ادا کے ساتھ حاضر جوابی اور لطیفہ گوئی میں بولتی گھڑی کی طرح جواب دیتی تھی۔ بہرام مارے محبت کے اسے ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا اور باتیں سن کر خوش ہوتا تھا جس وقت یہ مصرع کہا تو بہ امید جواب اس کی طرف دیکھا اس نے کہا:

"نام بهرام تراوپدرت بو جبله"

بادشاہ کو یہ انداز پسند آیا۔"(۱۴)

مندرجہ بالا واقعے سے دونوں مصرعہ بدیہہ گوئی کی روایت کا آغاز کرتے ہیں پہلے تو بہرام گور نے شیر کو زیر کرنے کے بعد فی البدیہہ کہا۔

منم آن پیل یله و منم آن شیریله

اس کے جواب میں اس کی معشوقہ نے دوسرا مصرعہ فی البدیہہ ہی موزوں کیا:

"نام بهرام تراوپدرت بو جبله"

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ فارسی شاعری کا آغاز ہی بدیہہ گوئی سے ہوا ہے۔ یہ نظارہ تھا قبل از اسلام کا بعد از اسلام بھی جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔

سامانی دور:

سامانی دور سے فارسی زبان وادب نے ارتقا کی منزلیں طے کی ہیں۔اس دور کا اہم بزرگ ترین اور فارسی ادب میں بابا آدم کہلانے والا شاعر رودکی سمرقندی ہے۔

رودکی سمرقندی اور سلطان نصر بن احمد کا واقعہ:

رودکی سمرقندی کی بدیہہ گوئی کے کئی واقعے درج ہیں جن میں سے ایک واقعے کو تقریباً سبھی تذکرہ نویسوں نے بیان کیا ہے یہاں تک کہ نظامی عروضی سمرقندی نے بھی رودکی سے متعلق حکایت کو اپنی کتاب **"مجمع النوادر چهار مقاله"** کے دوسرے

مقالے میں جگہ دی ہے۔ ہوا یوں کہ خاندان سامانی کا ایک مشہور بادشاہ نصر بن احمد اپنے دارالحکومت خراسان سے گرمیاں گزارنے کے لئے ''ہری'' کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں کا موسم نہایت پرفضا تھا، طرح طرح کے میٹھے میوے وہاں موجود تھے جانوروں کے لیے چراگاہ کا خوب انتظام تھا ایسی پرفضا جگہ سے دل لگانے کے بعد نصر بن احمد نے گرمی، جاڑہ، برسات اور بہار کے چاروں موسم گذار دیے، اس دور میں سامانیوں کی حکومت عروج پر تھی دشمنوں کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ فوج فرمانبردار اور وقت ان کے موافق تھا۔ اور مقدر بلندی پر تھا۔ اس طرح چار سال گذر گئے۔ ایک بادشاہ کی تفریحی خصلت کی بنا پر باقی مصاحب، وزراء، امراء اور لشکری پریشان ہو گئے۔ انہیں گھر کی یاد ستانے لگی۔ بادشاہ سے جب بھی کوئی گھر کی بات کرتا وہ بادشاہ کے دل میں ہری کی محبت کو گامزن پاتا۔ لوگ ڈرنے لگے کہ کہیں پانچواں سال بھی یہیں نہ بیت جائے آخر کار سب مل کر آدم الشعراء ابو جعفر رودکی کے پاس پہنچ گئے اور اس سے کہا کہ کوئی ایسی ترکیب نکالو کہ بادشاہ یہاں سے گھر کی طرف روانہ ہو جائے اس کے بدلے میں تمہیں پانچ ہزار اشرفیاں دی جائیں گی۔ کیوں کہ ہمارا دل بخارا کے لیے تڑپ رہا ہے۔ رودکی بادشاہ کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ جب بادشاہ صبح کی شراب پی کر بیٹھا ہوا تھا۔ رودکی بھی اپنی جگہ بیٹھ گیا اور جب گانے کا نمبر آیا تو اس نے چنگ اٹھا کر عاشقانہ لے میں فی البدیہہ یہ اشعار پڑھے۔ جیسا کہ ''چہار مقالہ'' میں درج ہے:

"بادشاہ را ساکن دیدند. ہوای ہری در سر او و
عشق ہری در دل او در اثنای سخن ہری را بہ
بہشت عدن مانند کردی بلکہ بر بہشت ترجیح
نہادی و از بہار چنین زیادت آوردی دانستند کہ

سـر آن دارد کـه ایـن تابستان نیز آنجا باشد پس سـر آن لشـکر و مهتران ملک به نزدیک استاد ابـو عبـد الله الـرودکـی رفتـند و از ندمای بادشاه هیـچ کـس محتشم ترو مقبول القول تر از و نبود گـفتـنـد پـنـج هـزار دیـنـار ترا خدمت کنیم اگر صنعتی بکنی که پادشاه ازین خاک حرکت کند کـه دلهای ما آرزوی فرزند همی بردو جان ما از اشتیـاق بخارا همی بر آید رودکی قبول کرد که نبـض امیـربگرفته بود و مزاج او بشتافته دانست کـه بـه نثـر بـا او در نـگیـر و روی به نظم آورد و قـصیده بگفت و بوقتی که امیر صبوح کرده بود در آمـد و بـه جـای خویش بنشست و چون مطر بـان فـرو داشتـنـد او چنگ بر گرفت و در پرده عشاق این قصیده آغاز کرد.

بـوی جـوی مـولیـان آیـد همـی
یـاد یـار مهـربـان آیـد همـی

ریگ آمـوی و درشتـی راه او
زیـر پـایـم پـرنیـان آیـد همـی

آب جیـحـون از نشـاط روی دوسـت

خنگ مارا تا میان آید همی

ای بخارا شادباش و دیر زی
میر زی تو شادمان آید همی
میر ماهست و بخارا آسمان
ماه سوی آسمان آید همی

شاه سرو است و بخارا بوستان
سرو سوی بوستان آید همی
چون رودکی بدین بیت رسید امیر چنان
منفعل گشت که از تخت فرود آمد و بی موزه
پای در رکاب خنگ نوبتی آورد روی به
بخارا نهاد.'' (۱۵)

نظامی عروضی سمرقندی:

خود نظامی عروضی بھی شاعر تھا لیکن اس کے زمانے میں دو اور نظامی نام کے شاعر (نظامی منیری اور نظامی اسیری) موجود تھے۔ اپنی بدیہہ گوئی کے واقعے کو خود نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ کے مقالہ دوم کی حکایت نمبر ۱۰ میں اس طرح درج کیا ہے:

''در آن تاریخ که من بنده در خدمت خداوند
ملک الجبال بودم ''نور الله مضجعه و رفع فی

الـجـنان مرضعه'' و آن بزرگوار در حق من بنده اعتـقـاد قـوی داشت و در تربیت من همت بلند مگر از مهتران و مهترزادگان شهر بلخ ''عمرها الـلـه'' امیر عمید صفی الدین ابو بکر محمد بن الـحسیـن الــروانشــاهــی روز عیـد فطـر بدان حـضـرت پیـوسـت جـوان فاضل مفضل دبیری نیک مستـوفی به شرط در ادب و ثمرات آن با بهـره در دلها مقبول و در زبانها ممدوح و درین حـال مـن بـخـدمـت حاضر نبودم در مجلس بر لـفـظ پـادشـاه رفـت کـه نظامی را بخوانید امیر عـمیـد صـفی الدین گفت که نظامی این جاست گـفتـنـد آری و او چـنـان گـمـان برد که نظامی مـنیـری اسـت گفت چه شاعری نیک و مردی معروف چو فراش رسید و مرا بخواند موزه در پـای کــردم و چـون در آمدم خدمـت کـردم و بـجـای خـویـش بنشستم و چون دوری چند در گـذشـت امیـر عـمید گفت نظامی نیامد ملک جبـال گـفت آمد اینک آنجا نشسته است امیر عـمیـد گـفـت مـن نه این نظامی را می گویم آن نـظـامـی دیـگـر اسـت و من این را خود نشناسم هـمیـدون آن پادشاه را دیدم که متغیر گشت و

در حال روی سوی من کرد و گفت جز تو جای
نظامی هست گفتم بلی ای خداوند دو نظامی
دیگر اند: یکی سمرقندی است و او را نظامی
منیری گویند و یکی نیشاپوری و اورا نظامی
اثیری گویند و من بنده را نظامی عروضی
خوانند گفت تو بهی یا ایشان امیر عمید
دانست که بد گفته است و پادشاه را متغیر دید
گفت ای خداوند آن هر دو نظامی معربدند و
سبک مجلسها را بعربده برهم شورند و بزبان
آرند ملک بر سبیل طیبت گفت باش تا این را
به بینی که پنج قدح سیکی بخورد و مجلس را
برهم زند اما ازین هر سه نظامی شاعر تر
کیست؟ امیر عمید گفت من آن دو را دیده ام
و بحق المعرفه شناسم اما این را ندیده ام و شعر
او نشنیده ام اگر درین معنی که برفت دو بیت
بگوید و من طبع او ببینم و شعر دل او بشنوم
بگویم و کدام بهتر است ازین هر سه، ملک
روی سوی من کرد و گفت ای نظامی تا ما را
خجل نکنی و چون گویی چنان گوی که امیر
عمید خواهد اندر آن وقت مرا در خدمت
پادشاه طبعی بود فیاض و خاطری وهاج و

اکـرام و انـعـام آن پـادشـاه مرا بدآنجا رسانیده بود که بدیهه من رویت گشته بود قلم بر گرفتم و تا دو بار دور در گذشت این پنج بیت بگفتم:

در جهــان ســه نـظــامیم ای شــاه
کـــه جهــانــی ز مــا بــا فـغــانـنـد

مـن بـور ســاد پیـــش تخـت شهم
و آن دو در مـرو پیـــش سـلـطانند

بـحـقیـقـت کــه در سـخن امروز
هــر یــکـی مـفـخـر خـراسـانـنـد

گـر چـه هـمـچـون روان سخن گویند
در چـه هـمـچـون خـرد سخن دانند

مـن شـرابـم کــه شـان چو دریابم
هــر دو از کــار خـود فـرو مـانند

چـون ایـن بیـت ها عرض کردم امیر عمید صفی الـدیـن خـدمت کرد و گفت ای پادشای نظامیان را بـگـذار مـن از جـمـلـه شعرای ماوراء النهر و خراسان و عراق هیچ کس را طبع آن نشناسم که

بر ارتحال چنین پنج بیت تواند گفت". (۱۶)

غزنوی دور:

سامانی دور کے بعد فوراً غزنوی دور کا آغاز ہوجاتا ہے یہ دور فارسی ادب کے لئے نہایت سازگار رہا۔محمود غزنوی خود بھی ادب پرور وادب نواز تھا۔اسی نے ملک الشعراء کے عہدے کا انتخاب کیا جس پر فردوسی کے ہوتے ہوئے عنصری کو سرفرازی حاصل ہوئی۔فردوسی نے شاہنامہ لکھا جو فارسی ادب کی طرف سے تمام زبانوں کے لئے عظیم تحفہ رہا۔

محمود غزنوی اور ایاز کی محبت سے تمام لوگ اچھی طرح واقف ہیں۔ایاز محمود غزنوی کا غلام بھی تھا اور پسندیدہ کردار بھی۔علامہ اقبال نے ان کرداروں کو طرح طرح سے نظم کیا ہے۔ایک غزل میں ان کے عاشقانہ کردار پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں (۱۷)

یہاں علامہ اقبال نے زلف ایاز کا تذکرہ کیا ہے۔

محمود،ایاز اور عنصری:

''زلف ایاز'' سے متعلق ہی عنصری نے فی البدیہہ ایک رباعی کہی تھی۔جس کے پس پشت عجیب واقعہ نمودار ہوا تھا۔ ہوا یوں کہ ایک رات محمود غزنوی شراب کے نشے میں غرق تھا۔ایاز اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔اس کے دونوں گالوں پر اس کی خوبصورت گرہ دار دراز زلفیں اس طرح لہرا رہی تھیں کہ محمود غزنوی ان سے کھیلتے کھیلتے

شرع کی حدوں کو عبور کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں ایک محتسب وہاں آ گیا اور اس نے محمود غزنوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ اس کی نصیحت سے ڈر گیا۔ لہٰذا اس نے قینچی نکال کر ایاز کو دے کر کہا تم اپنی زلفوں کو کاٹ دو۔ ایاز نے بادشاہ کی مرضی کے مطابق بال تراش دیے۔ محمود ایاز کو انعامات سے نواز کر نشے کی حالت میں سو گیا۔ صبح کو جب بیدار ہوا تو رات کے واقعے کو یاد کر کے مضطرب و پریشان ہونے لگا۔ اسی ندامت کے عالم میں بستر پر کبھی بیٹھتا اور کبھی لیٹ جاتا اور کبھی اٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ کسی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ بادشاہ سے کوئی بات کر سکتا۔ لیکن اس کے ندیم خاص علی حاجب نے عنصری کو سارا واقعہ سنا کر کہا کہ کوئی ایسی تدبیر کرو کہ بادشاہ کی خود طبعی لوٹ آئے۔ عنصری اس ندیم کا حکم بجا لاتے ہوئے بادشاہ کے پاس گیا اور آداب بجا لایا۔ بادشاہ نے سر اٹھا کر کہا تو دیکھ رہا ہے کہ کیا واقعہ پیش آیا۔ اس سلسلے میں کوئی ایسی بات کہہ جو موقع کے لحاظ سے موزوں ہو۔ عنصری نے فی البدیہہ رباعی لکھ کر سنائی۔ محمود غزنوی نے جب یہ رباعی سنی تو بہت خوش ہوا اور حکم دیا کہ اس کام کے بدلے عنصری کا منہ تین بار جواہرات سے بھر دیا جائے اور موسیقاروں کو حکم دیا کہ اس رباعی کو نغمہ و ساز پر گائیں۔ جیسا کہ صاحب ''خزانہ عامرہ'' نے تحریر کیا ہے:

''شبی سلطان محمود ساغر شراب می پیمود در حالت مستی نظرش بر زلف ایاز افتاد و سر رشتۂ اختیار از دست داده، خواست که با معشوق هم آغوشی نماید و دری از حظ نفس بر روی خود کشاید اما بر دیت برهان الهی دست ازان اراده باز کشید و چون ریشۂ فساد زلف دوانیده بود ایاز را فرمود تا نیمه زلف را قطع کند و سر رشته

فساد را کوتاه سازد ایاز نیمۂ زلف بریده پیش سلطان گذاشت و بحکم ضرورت شب موسم بهار را کوتاه ساخت چون سلطان از حالت مستی بافاقه آمد و سلسلۂ دوستی بریده دید سخت بی دماغ شد تا بحدیکه هیچکس از حضار محفل یارای دم زدن نداشت. علی حاجب روبه عنصری آورده گفت: توانی که مزاج سلطان را به حال آید. عنصری پیش رفت و این رباعی بدیهه به عرض رسانید:

﴿رباعی﴾

گر عیب سر زلف بت از کاستن است
چه جای به غم نشستن وخاستن است
وقت طرب و نشاط ومی خواستن است
کاراستن سرو ز پیراستن است

سلطان از استماع این رباعی خیلی منشرح گردید و شعلۂ جوالۂ غضب فرو نشست فرمود تا سه بار دهان عنصری را از جواهر پر ساختند، و مطربان را حکم کرد تا رباعی را بنغمه و ساز سرائیدند." (۱۸)

عنصری، عسجدی، فرخی اور فردوسی کا واقعہ:

اس ذیل میں ایک واقعہ دورِ غزنوی سے ہی متعلق اور بیان کیا جاتا ہے۔ جس میں اس دور کے چاروں بزرگ شاعروں عنصری، عسجدی، فرخی اور فردوسی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور ایک ہی رباعی کے چار مصرعوں کو الگ الگ شاعروں نے فی البدیہہ کہا ہے۔ گویا رباعی کے چاروں مصرعے جداگانہ چاروں شاعروں کے ہیں۔ ہوا یوں کہ فردوسی اپنی قسمت آزمانے کے لئے ہرات سے غزنہ آیا۔ جہاں ایک باغ میں اپنے دوستوں کو ملنے کے لئے بلایا۔ وہاں عنصری، فرخی اور عسجدی پہلے سے موجود تھے۔ پہلے تو ان درباری شاعروں نے فردوسی کا خوب مذاق اڑایا اور شعر آزمائی کی دعوت دے کر بظاہر ایسا قافیہ تلاش کیا کہ جس میں چوتھا قافیہ ملنا مشکل تھا۔ سب سے پہلے ملک الشعرا عنصری نے پہلا مصرعہ کہا پھر فرخی نے دوسرا مصرعہ موزوں کیا اس کے بعد عسجدی نے تیسرا مصرعہ لگایا اب چوتھا مصرعہ فردوسی کو چپکانا تھا۔ فردوسی نے فی البدیہہ مصرع کہا:

عنصری: چون عارض تو ماہ نباشد روشن

فرخی: مانند رخت گل نبود در گلشن

عسجدی: مژگانت ھمی گذر کند ار جوشن

فردوسی:: مانند سنان گیو در جنگ پشن

فردوسی کا برجستہ مصرعہ سن کر تینوں شاعر حیران ہوئے۔ وہ لفظ ''پشن'' سے ناواقف تھے جب فردوسی نے بتایا کہ یہ ایک ایرانی پہلوان کا نام ہے جس کا باپ ''درز'' خود بھی ایرانی پہلوان تھا۔ اس کا ایرانی قصوں میں بہت نام ہے۔ اس طرح اس برجستگی اور بدیہہ گوئی کی بنا پر فردوسی کامیاب ہوگیا۔

''آتشکدہ آذر'' نے اس واقعہ کو اس طرح درج کیا ہے:

"اولاً باید امتحان او بشعر کرد، والحق طرفه محکی است. اگر از اهل حال باشد، ندامتی نخواهیم داشت و الا عذر او خواهیم خواست. پس عنصری گفت: ای برادر، ما سه کس از شاعران سلطانیم و در مجلس شعرا غیر شاعر را مدخلی نیست. ما هر یک مصرعی می گوییم، اگر مصرع چهارم را تو گفتی، با هم صحبتی خواهیم داشت. و الا بر خود و بر ما مجلس را تنگ مگردان. پس هر یک مصرعی گفتند:

عنصری: چون عارض تو ماه نباشد روشن

فرخی: مانند رخت گل نبود در گلشن

عسجدی: مژگانت همی گذر کند ار جوشن

فردوسی:: مانند سنان گیو در جنگ پشن

یاران از حسن مقال او متعجب گشته، عنصری گفت: خوب گفتی: مگر تو از تاریخ سلاطین عجم آگاهی؟ گفت: بلی و تاریخ ایشان همراه دارم. عنصری وی را در ادبیات مشکله و اشعار معضله آزموده و قادر یافت و گفت: ای برادر، مارا معذور دار، که ترا نشناخته و فضل ترا ندانسته بودیم و او را مصاحب خود

ساخت". (۱۹)

فردوسی کی بدیہہ گوئی:

محمود غزنوی نے فردوسی کو بھی "حسن خط ایاز" پر شعر موزوں کرنے کی دعوت دی تھی۔ جس پر فردوسی نے بدیہتہً شعر موزوں کیے تھے۔ "آتشکدہ آذر" کے مطابق:

"درین حال سلطان دو بیت در حسن خط ایاز از یاران التماس کرده ایشان از راه ادب اشاره به فردوسی کردند. بدیهةً بعرض رسانید:

مستست همی چشم تو و تیر به دست
بس که ز تیر چشم مست تو بخست
گر پوشد عارضت زره، عذرش هست
کز تیر بترسد همه کس، خاصه زمست

سلطان فرمود: لِلّه درک که مجلس ما را فردوس ساختی. و در پهلوی (قصر) خود جای دلگشا بجهت او سر انجام کرده". (۲۰)

مسعود سعد سلمان لاہوری:

ہندوستان میں بھی غزنوی دور سے ہی شاعری کا آغاز ہوا۔ یوں تو محمود غزنوی نے ہندوستان پر کئی فاتحانہ حملے کئے۔ لیکن اس کا اصل مقصد ان حملوں کے ذریعے صرف مال و زر کا لوٹنا تھا۔ اس کے باوجود اس نے پنجاب پر اپنی حکومت بھی قائم کی۔ لاہور کو پایۂ

تخت بنا کر سلطنت کا آغاز کیا۔اسی دور میں ''مسعود سعد سلمان لاہوری'' فارسی کا ایک بڑا شاعر بن کر ابھرا۔اس کو بھی فی البدیہہ شعر گوئی کی مکمل مہارت تھی۔لہٰذا خزانہ عامرہ میں درج ہے۔

''ابو سعد بن مسعود بن سلمان لاهوری زمین سخن به وراثت ملک یمین اوست و قلمرو بیان از فیض پدر وجد زیر نگین او. صاحب هفت اقلیم گوید، در مجلس سلطان بهرام شاه به این رباعی او را امتحان کردند. او بدیهه گفت و سلطان فرمود تا دهانش را به پر زر کردند. ''

همواره رخ نگاه ماه نواست نه گل
زین روی رخ نگار نیکوست نه گل
مارا رخ دوست باید ای دوست نه گل
زیرا گل چشم مارخ اوست نه گل (۲۱)

اس فی البدیہہ رباعی کو سن کر بہرام شاہ نے حکم دیا کہ اس کے دہن کو زرو جواہر سے بھر دیا جائے۔

شہاب الدین:

بہرام شاہ کے ہی دور میں شہاب الدین ایک مشہور شاعر ہوا ہے۔ بدیہہ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ ایک دن اسے ایک شخص نے نرگس اور گلاب کے پھولوں کا ایک گلدستہ پیش کیا۔اس نے فوراً ایک قطعہ موزوں کیا۔جس میں ان پھولوں، ان کی تشبیہات

اور موقع کی نزاکت کو نہایت خوبصورتی سے موزوں کیا گیا ہے۔''آتشکدہ آذر'' میں ہے:

"گویند: روزی شخصی چند دسته گل و نرگس
بجهت او فرستاده (وی) این قطعه را گفته:
شاخکی چند نرگس رعنا
گلگی چند تازه و چیده
آن همه دیدهای بی چهره
وین همه چهره های بی دیده(۲۲)

عہد سلطنت:

غزنویوں کو زیر کرنے کا سہرا شہاب الدین غوری کے سر ہے جس نے نہ صرف پنجاب کو فتح کیا بلکہ دہلی کی طرف بھی پہلا قدم رکھا۔ پرتھوی راج چوہان کو شکست دے کر اپنے غلام قطب الدین ایبک کو مہار سلطنت سونپ دی۔ جس نے غلام خاندان کی بنیاد رکھ کر ہندوستان کے مرکز دہلی سے تمام ہندوستان کو فتح کرنے کے خواب دیکھے۔ اسی عہد غلامان میں ایرانی شاعروں کے دعووں پر ضرب لگاتے ہوئے امیر خسرو دہلوی نے اپنی شاعری کا آغاز اس طرح کیا کہ ایرانی بھی اس کا لوہا ماننے سے انکار نہ کر سکے۔

امیر خسرو کی ایک رباعی:

امیر خسرو کو بدیہہ گوئی میں ملکہ حاصل تھا۔ خسرو کو اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں بدیہہ گوئی کا امتحان دینا پڑا۔ ہوا یوں کہ جب ان کے والد نے خوش نویسی کی مشق کے لیے مولانا سعد الدین خطاط کے پاس خسرو کو بٹھایا تو خسرو کو پڑھنے سے زیادہ، بلکہ خطاطی کے بدلے شعر گوئی کی دھن رہتی تھی۔ اسی دور میں خواجہ واصل کوتوال کے نائب تھے جو سعد الدین کو خط لکھوانے کے لئے بلوا لیتے تھے ایک دن خسرو بھی ان کے ساتھ گئے۔ جہاں خواجہ عزیز الدین بھی موجود تھے۔ سعد الدین نے خسرو کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ لڑکا بھی موزوں ناموزوں شعر کہہ لیتا ہے۔ یہ سن کر انہوں نے خسرو سے شعر پڑھوائے۔ شعر خسرو کی عمر سے زیادہ پختہ تھے۔ لہٰذا یقین نہ ہوا کہ شعر انہیں کے ہیں اور امتحان لینے کے لئے چار بے جوڑ چیزوں کے نام دے کر کہا ان الفاظ کو شعر میں موزوں کرو وہ لفظ تھے۔

۱ مو ۲ بیضہ ۳ تیر ۴ خربوزہ

خسرو نے ان بے جوڑ الفاظ کو دیکھا تو امتحان کے طور پر کامیاب ہونے کی کوشش کی۔ خسرو نے ان چاروں الفاظ سے صرف شعر ہی نہیں کہا بلکہ فارسی شاعری کی اہم اور مشکل صنف رباعی میں ان چاروں بے جوڑ الفاظ کو بڑی خوبصورتی اور برجستگی سے مضمون کے ساتھ موزوں کر دیا۔ انہوں نے برجستہ کہا۔

هر موی کہ در دو زلف آن صنم است
صد بیضہ عنبرین بر آن موی صنم است
چون تیر راست دلش را زیرا
چون خربزه دندانش درون شکم است (۲۳)

امیر خسرو کی رباعی سن کر جہاں سعد الدین کو فخر ہوا وہیں حاضرین ان کی برجستگی اور حاضر دماغی پر حیران رہ گئے۔

امیر خسرو اور حضرت نظام الدین اولیاؒ:

اسی طرح ایک بار امیر خسرو جو کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے چہیتے مرید اور خلیفہ بھی تھے ایک بار مرشد خواجہ نظام الدین اولیاء کے ساتھ لب دریا کوٹھے پر چڑھ کر کسی ہندو تیوہار (وسنت پنچمی) کے موقع پر اہل ہنود کو اشنان کرتے دیکھ رہے تھے کہ خواجہ صاحب نے فرمایا:

هر قوم راست راهی دینی و قبله گاهی

اس وقت اتفاق سے خواجہ صاحب کی کلاہ ترچھی ہوگئی تھی۔ اسی ترچھی ٹوپی کی طرف اشارہ کر کے امیر خسرو نے فی البدیہہ دوسرا مصرعہ لگایا۔

ما قبله راست کردیم بر طرف کج کلاهی (۲۴)

اس طرح یہ شعر مکمل ہوگیا۔

امیر حسن سجزی کی ایک غزل:

دراصل یہ شعر امیر حسن سجزی کی ایک غزل کا مطلع ہے۔ ظاہر ہے یہ غزل اس دور میں مقبول خاص و عام رہی ہوگی اور یہ دونوں مصرعے حضرت نظام الدین اولیاؒ اور امیر خسرو کی زبانی برجستہ و برمحل بات میں زور پیدا کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ غزل اس طرح ہے:

هر قوم راست راهی دینی و قبله گاهی
ما قبله راست کردیم بر سمت کج کلاهی
خیز ای خطیب برخوان هر خطبهٔ که داری
رویش نگر چو عیدی و ابر و نماز گاهی
گر سرو مه ندیدی با یکدگر موافق
بالاش بین چو سروی بالای سرو ماهی
با آنکه کرد توبه فسق از دلم فراموش
هم گر لبش ببینم یاد آمدم گناهی
گر بند بر گشایند از زلف ظالم او
از هر خمی بر آید فریاد داد خواهی
هر صبح اشک من بین سر بر زده ز مژگان
چون شبنمی که افتد بر نوک هر گیاهی
یارب نگاه داری چشم و چراغ مارا
گرچه نکرد هرگز در حال ما نگاهی
قاضی گواه مطلب بر عشقبازی من
دانی که نیست حاجت اقرار را گواهی
عقل حسن چه گنجد اندر حضور عشقش
طفل جهان ندیده در پیش پادشاهی(۲۵)

سلجوقی دور:

ایران میں یہ زمانہ ان سلجوقی بادشاہوں کا ہے جنہوں نے ہر خاندان سے زیادہ ایران میں حکومت کی ہے۔ آٹھویں صدی ہجری کا مشہور شاعر جلال طبیب جو آل مظفر کے دور کا مشہور طبیب تھا، اسی لیے اسے دارالشفا کا انچارج بنا دیا گیا تھا بقول بندرا بن داس خوشگو:

''در روزگار آل مظفر طبابت دارالشفا به او متعلق بود. داستان گل و نوروز نام را در سنه هفتصد و سی و چهارم نظم کرده''. (۲۶)

شاہ شجاع اور جلال طبیب:

جلال طبیب نہایت ذہین اور فن شعر سے بخوبی واقف تھا۔ ہنسی مذاق کا دلدادہ ہونے کی بنا پر طنز و مزاح میں اپنی مثال آپ تھا۔ بادشاہ کے امرا، وزرا پر بھی جملہ بازی سے باز نہیں آتا تھا۔ بقول دولتشاہ سمرقندی:

''بروزگار آل مظفر در فارس حکیم و طبیب بوده و باوجود حکمت و طبابت شعر نیکو میگفت و علم شعر نیکو میدانست و داستان گل و نوروز را او نظم کرده در شهور سنه اربع و ثلثین و سبعمائة و آن کتاب شهرتی عظیم یافته و درمیان مبتدیان و جوانان متداول است. هرچند

مثنوی آن خالی از فتوری نیست اما روان و
صاف است چنین گویند که مولانا نسیمی
نیشاپوری در یک ماه بیست نسخه گل و
نوروز نوشته از قدرت او بر کتابت تعجب
است، گویند که مولانا جلال طبیب حقۂ مفرّح
جهت شاه شجاع بیاورد و خواص آن را درین
شعر نظم کرده(۲۷)

یہاں تک اس نے ایک بار شاہ شجاع کے لیے ایک معجون تیار کی تو شاہ شجاع کی خواہش کے مطابق فوراً ایک طنز ومزاح سے پر مندرجہ نظم موزوں کرڈالی:

جلال ساخته است این مفرّح دلخواه
به رسم پیشکش آورده نزد حضرت شاه
بدن قوی کند و طبع شاد و فکرت تیز
حدیث نرم و زبان جاری و سخن کوتاه
شود بدیل می ناب در تفرّج طبع
بود به جای سقنقور در تهیّج باه
وگر تناول او در شب اتفاق افتد
منش غذا طلبد هم زبامداد پگاه
جوانی آرد و پیری کند بدل به شباب
موافق بدنست او چو روح بی اشباه(۲۸)

بادشاہ اس نظم سے نہایت محظوظ ہوااوراس کی تعریف کرتے ہوئے اس کو بہت زیادہ انعام

واکرام سے نوازا۔

حافظ شیرازی کے ایک شعر کی حقیقت:

یہی زمانہ حافظ شیرازی کا ہے جسے فارسی زبان وادب میں ایسا الہامی شاعر کہا جاتا ہے کہ جس کے دیوان سے فال بھی نکالی جاتی ہے۔اسی لیے مولانا عبدالرحمٰن جامی نے"**نفحات الانس**" میں انہیں''لسان غیب''اور''ترجمان اسرار'' سے یاد کیا ہے۔لکھتے ہیں:

"وی لسان الغیب و ترجمان الاسرار است بسا
اسرار غیبیه و معانی حقیقیه که در کسوت صورت و
لباس مجاز باز نموده است". (۲۹)

(یہاں تک کہ اس کی ایک مشہور زمانہ غزل کے مندرجہ شعر:

آسمان بار امانت نتوانست کشید
قرعه کار بنام من دیوانه زدند (۳۰)

کو ہی تبدیل کر کے''کار''کے مقام پر''فال''رکھ دیا گیا اور شعر اس طرح تحریر کیا گیا:

آسمان بار امانت نتوانست کشید
قرعه فال بنام من دیوانه زدند (۳۱)

اکثر دیوان حافظ میں یہی شعر تحریر کیا جاتا ہے۔

حافظ شیرازی کی بدیہہ گوئی:

بدیہہ گوئی میں حافظ کو جو مہارت حاصل تھی وہ اظہر من الشمس ہے۔کہتے ہیں کہ

شروع میں ان کے شعر نہایت کم درجے کے ہوتے تھے اور مشاعروں میں ان کے کلام کی کوئی اہمیت نہ تھی بلکہ اس دور کے شعراء ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک روز انہوں نے بابا کوہی کے مزار پر جا کر آہ و زاری کے ساتھ گڑگڑا کر دعا کی۔ ان کو بشارت حاصل ہوئی اور فی البدیہہ یہ غزل پڑھتے ہوئے اٹھے:

دوش وقت سحر از غصه نجاتم دادند
وندر آن ظلمت شب آب حیاتم دادند
بیخود از شعشعه پرتو ذاتم کردند
باده از جام تجلی صفاتم دادند
چه مبارک سحری بود و چه فرخنده شبی
آن شب قدر که این تازه براتم دادند
بعد از این روی من و آینه وصف جمال
که در آن جا خبر از جلوه ذاتم دادند
من اگر کام روا گشتم و خوشدل چه عجب
مستحق بودم و این ها به زکاتم دادند
هاتف آن روز به من مژده این دولت داد
که بدان جور و جفا صبر و ثباتم دادند
اینهمه شهد و شکر کز سخنم می ریزد
اجر صبریست کز آن شاخ نباتم دادند
همت حافظؒ و انفاس سحرخیزان بود

کہ ز بند غم ایام نجاتم دادند (۳۲)

عہد مغول (ہند)

ہندوستان میں شعر وشاعری کا آغاز تو غزنوی دور کے شعرا خصوصاً مسعود سعد سلمان، نکتی اور رونی جیسے شعرا سے ہوا تھا لیکن اصل شاعری کی معراج عہد مغول میں نظر آتی ہے۔

ظہیر الدین محمد بابر کی بدیہہ گوئی:

مغل عہد کے سبھی حکمران شعر فہم، نکتہ سنج اور خود شعر وشاعری سے شغف رکھنے والے تھے۔ چنانچہ ہندوستان میں اس عہد کی بنیاد رکھنے والا ظہیر الدین بابر خود بھی شاعر اور نثر نگار تھا۔ گو کہ اس کے جواہر پارے ترکی زبان میں ہیں۔ لیکن اسے فارسی زبان سے بھی اچھا خاصہ لگاؤ تھا۔ وہ فارسی زبان میں فی البدیہہ شعر کہنے کی مہارت رکھتا تھا۔ جیسا کہ بزم تیموریہ کے جلد اول میں مندرج ہے۔

''پانی پت کی لڑائی کے موقع پر بابر غیر ملکی ماحول سے پریشان تھا، اجنبی حریف کی اجنبی زبان سے اس کے ساتھی بھی کچھ بد دل تھے۔ گھبرا کر اس نے ایک شعر کہا:

شدہ جمعی و بود جمعی پریشان
گرفتار قومی و قومی عجائب (۳۳)

بابر اور نظام خان:

بیانہ کے قلعے کی تسخیر کے موقعہ پر بابر نے اس کے حاکم نظام خان کو وعدہ وعید کے فرمان بھیجے، اور اس فرمان پر فی البدیہہ قطعہ بھی لکھ بھیجا، جس میں بیانہ اور بیان کی

رعایت لفظی ملاحظہ ہو'۔

با ترک ستیزہ مکن ای میر بیانہ
چالاکی و مردانگی ترک عیان است
گر زود نیائی و نصیحت نہ کنی گوش
آنجا کہ عیان است چہ حاجت بہ بیان است (۳۴)

مندرجہ بالا فی البدیہہ قطعہ کے ذریعے بابر نے ایک طرح رجز پڑھنے کا کام لیا ہے جسے اپنے قبیلے جس میں تیمور اور چنگیز جیسے ظالم و جابر و بہادر وشجاع بادشاہ گزر چکے ہیں انہیں کے کارناموں جیسے میرے کارنامے بھی ہوں گے۔

بابر اور اس کی بدیہہ ہزل گوئی:

بدیہہ گوئی کا ایک خاص عنصر ہزل گوئی بھی ہے۔ یوں تو یہ شریفوں کا شیوہ نہیں ہے لیکن دوستوں کی محفل میں شرافت کے پردے خود بخود اٹھ جاتے ہیں بابر بھی اس صفت سے مستثنیٰ نہیں رہا۔ اس نے خود اس واقعے کی خوبصورت تصویر کھینچی ہے:

''نماز سے پہلے یدہ سرا میں آئے، آفتاب نکلے لشکر والے سیر کرتے ہوئے آنے شروع ہوئے، یہ لوگ دور دراز سے فریق اریق میں ٹھہرے ہوئے تھے مگر ہم کو نہ دکھائی دیے، جلسہ میں اکثر وہ لوگ تھے جو شعر کہتے تھے، جیسے شیخ ابوالوحید، شیخ زین ملا علی خاں، تردی بیگ اور خاکسار وغیرہ، اثنائے صحبت میں محمد صالح کا یہ شعر پڑھا گیا:

محبوبی ہر عشوہ گری را چہ کند کس

جایی کہ تو باشی دگری را چہ کند کس

فرمائش کی کہ اس زمین میں کچھ شعر کہو، شاعر اور موزوں طبع فکر کرنے لگے، ملا علی خاں سے بہت ہنسی کھلی ہوتی تھی، ہنسی سے میں نے فی البدیہہ یہ شعر کہا:

مانند تو مدھوش گری را چہ کند کس

نر گاو کسی مادہ خری را چہ کند کس

پہلے اس سے جو کچھ اچھا برا کہنے یا ہزل نظم کرنے کا اتفاق ہوتا تھا تو لکھ لیا جاتا تھا، جب سے مبین کو نظم کیا جانے لگا تو دل میں آیا کہ جس زبان سے یہ پاک الفاظ نکلیں حیف ہے کہ اس سے بیہودہ لفظ بھی نکلیں اور جس دل میں ایسے مقدس مضامین کھلیں، افسوس ہے کہ ایسے ناپاک خیال بھی پیدا ہوں، اسی دن سے ہزل کہنا ترک کر دیا تھا، اس شعر کے کہتے وقت اصلا خیال نہ رہا، دو ایک روز کے بعد بکرام میں آ کر مجھے جاڑے سے بخار چڑھا، کھانسی بھی ہوگئی اور کھنکار میں خون آنے لگا، اب میں سمجھا کہ یہ تنبیہ کس طرف سے ہے اور یہ تکلیف کیوں ہے':

'فَمَنْ نَكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهِ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عليهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْماً ''(۳۵) میں نے بار دگر توبہ کی اور اس نالائق طرز سے دل ہٹایا، سچ یہ ہے کہ کسی گناہ گار بندے کے دل میں ایسے خیال کا پیدا ہونا ایک بڑی دولت ہے جو خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے، جو بندہ اس طرف متنبہ ہو

جائے وہ اس کو سعادت عظمیٰ سمجھے''۔ (۳۶)

دور نصیرالدین محمد ہمایوں:

ظہیرالدین بابر کے بعد اس خاندان کی عنان حکومت نصیرالدین محمد ہمایوں کے ہاتھوں میں آئی۔ نصیرالدین ہمایوں نرم دل و انصاف پرور بادشاہ تھا بھائیوں کی محبت بھی اس کے دل میں گھر کیے تھی انہیں بنیادوں پر شیر خان نے اسے جگہ جگہ شکست دے کر ایران بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ہمایوں کا فی البدیہہ شعر:

منتخب التواریخ جلد اول میں ہمایوں کے فی البدیہہ کہے گئے ایک شعر کی جانب اس طرح اشارہ کیا گیا ہے::

''اس زمانے مارواڑ کے راجہ مالدیو نے ہمایوں کے پاس عریضے لکھ کر اسے آنے کی دعوت دی۔ ہمایوں نے بھی ان حالات میں بکت اور ٹھٹھہ کا قیام مناسب نہ جانا اور جیسلمیر کے راستے سے مارواڑ چلا گیا۔ واپسی کے وقت راجہ جیسلمیر نے اس کا راستہ روکنا چاہا لیکن تھوڑی سی لڑائی کے بعد ہی وہ شکست کھا کر پیچھے ہٹ گیا۔ جس جنگل سے لشکر گزر رہا تھا وہ ایسا بے آب و گیاہ صحرا تھا کہ پینے کے لیے میلوں تک پانی کا قطرہ بھی نہیں ملا اور سارے لشکر والے بڑی مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ اگر خوش قسمتی سے کوئی کنواں نظر آ جاتا تو سپاہی اس طرح ہجوم بنا کر حملہ کرتے

کہ اچھا خاصا دنگا فساد ہو جاتا تھا اور پیاس کے مارے بہت سے
کنویں میں کود پڑتے تھے اور کنواں ان گرنے والوں سے بھر جاتا
تھا، ہمایوں نے اس حالت کو دیکھ کر یہ شعر کہا تھا:

چنان زد خاک ها گردون لباس دردمندان را
که نی دست آستین می باید و نی سر گریبان را (۳۷)

ہمایوں کی ملا حیرتی کے شعر پر اصلاح:

ہمایوں کا شعری ذوق اتنا بلند تھا کہ وہ دوسرے شاعروں کے شعروں پر اکثر فوری اصلاح دیا کرتا تھا۔ ایسا ہی ایک واقعہ بزم تیموریہ میں اس طرح ملتا ہے۔

''ہمایوں ان شعرا کو اپنی علم پرور صحبتوں میں ہمیشہ شریک رکھتا اور
شاعری کی مجلسیں برابر گرم رہتیں ہمایوں کی نکتہ سنجی، دقت نظر اور
معانی آفرینی کی جلا ان صحبتوں میں خوب ہوئی، جس کے باعث
وہ اکثر اساتذہ کے کلام میں بلا تکلف اصلاحیں دیتا تھا۔ ایک بار
ملا حیرتی نے اس کے سامنے یہ شعر پڑھا:

همچون پروانه به شمعی سروکار است مرا
پس اگر پیش روم بال و پرم می سوزد

ہمایوں نے دوسرے مصرعہ میں یوں اصلاح دی:

می روم پیش اگر بال و پرم می سوزد

ملا حیرتی اس اصلاح سے بہت محظوظ ہوئے۔ (۳۸)

ہمایوں کیجا ہی تیمان کے شعر پر اصلاح:

جاہی تیمان نے شاہ محمد خان شاہ پور والی کابل سے ناراض ہو کر اس کی ہجو کہی، ہمایوں کے سامنے وہ ہجو پڑھی گئی:

شاعر شاہ همایونم و خاک درگه
می زند کوکبه شاعریم طعنه بمه
خسرو شوم و ابیات خوشم خیل و سپه
دیدم از قحبه زنی ظلم نه جرم و نه گنه
پاره کاغذ اگر از هذیان گشته سیه
سوی هجوش اگر اندیشه شود روی بره
غرض آنست که این خر صفتان ابله
عزت و حرمت این طائفه دارند نگه
وای آنکس که بخیل شعرا بستیزد
هر که با ما بستیزد به بلا بستیزد

آخری مصرعہ کو سن کر ہمایوں نے فی البدیہہ کہا اس کو اس طرح پڑھو:

هر که باما بستیزد به خدا بستیزد" (۳۹)

اور یہ فی البدیہہ اصلاح اپنی جگہ اپنی مثال آپ ہے۔

ہمایوں نے ایران کے صفوی خاندان کے بادشاہ، شاہ طہماسپ کی مدد سے ہندوستان میں حکومت حاصل کی تھی۔ اسی وجہ سے ایک مدت تک صفوی خاندان اور مغل خاندان کے بادشاہوں میں برادرانہ تعلقات رہے اور دونوں ہی ملکوں میں فارسی شاعری کے ساتھ بدیہہ گوئی کا بھی رواج بڑھتا رہا۔ یہاں دونوں خاندان سے متعلق شعرا کی بدیہہ گوئی کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

امیر غیاث الدین خلقیؔ کی غزل:

امیر غیاث الدین خلقیؔ شاہ اسماعیل کے دور کا مشہور و معروف شاعر تھا۔ جو اتفاق سے دماوند کے علاقے کے موضع شکراب میں منصب صدارت پر فائز رہا اور ترقی کرتے کرتے امارت کے عہدے تک پہنچ گیا۔ اکثر امرا اس سے حسد کرنے لگے یہاں تک کہ خراسان کے امیر الامرا نے اس کو قتل کرا دیا اس وقت اس نے ایک غزل موزوں کی بقول خوشگو:

"امیر غیاث الدین خلقی تخلص، ابن امیر یوسف، از موضع شکر آب مضاف دماوند است. منصب صدارت داشت. بعد از آن به امارت رسید. صاحب طبل و علم گردید. امیر کان، امیر الامرای خراسان، حسد برده او را به قتل رسانید. در آن وقت غزلی گفته. این بیت از آن است:

به تیغ ظلم مرا می کشی و خواهی دید
که عاقبت چه کند با تو خون ناحق من (۴۰)

میرزا محمد بن یوسف اہلیؔ شیرازی:

میرزا محمد بن یوسف اہلیؔ شیرازی کا شمار فارسی کے اہم ترین شعرا میں کیا جاتا ہے جنھوں نے اپنے کلام میں کچھ نہ کچھ حیرت انگیز کارنامے انجام دیے ہیں۔ اہلی شیرازی نے دو ہزار اشعار پر مبنی ایک ایسی مثنوی ''سحر حلال'' موزوں کی تھی۔ جس کا ہر

شعر دو بحور، دوقوافی اور صنعت تجنیس سے مرصع و مسجع ہے۔ بقول خوشگو:

"اورا مثنوی ایست مشهور به سحر حلال، به دو هزار بیت، مشتمل بر قصه تعشق جمشید که هر بیتش ذو بحرین و ذو قافیتین و تجنیسات واقع است. الحق کارستانی نمود که حد بیشتر نیست.

این دو بیت از آنجاست:

ای همه عالم برِ تو بی شکوه
شوکت خاک درِ تو پیش کوه
نام تو زان بر سر دیوان بود
کآتش بال و پر دیوان بود (۴۱)

بدیہہ گوئی سے متعلق ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جہاں شاعر وقت جانکنی فی البدیہہ اپنی حیات کے آخری اشعار موزوں کرتا ہے۔ ۹۴۲ھ ہجری میں دارالبقا کی جانب کوچ کیا اور وقت نزع ایک غزل موزوں کی:

"در نهصد و چهل و دو، آهنگ سرای جاودانی کرد. وقت نزع غزلی گفته، وصیت کرد که در پهلوی خواجه حافظ دفن کنند. آن غزل این است:

جایم به روز واقعه پهلوی او کنید!
او قبلهٔ من است، رخم سوی او کنید! (۴۲)

اور مکمل غزل دیوان اہلی شیرازی سے نقل جاتی ہے:

نخلی بر آورید بلند و به سایه اش
خاکم بیاد قامت دلجوی او کنید!
محراب وار بر سر سنگ مزار من
نقشی بصورت خم ابروی او کنید!
در بیستون برید مرا پیش کوه کَن
جای شهید عشق به پهلوی او کنید!
بوی وفا اگر نشنیدید از کسی
بویی بخاک تربتم از بوی او کنید!
زنار بت پرستی خود می برم بخاک
یعنی که رشته کفنم موی او کنید!
در شیشه ای کنید گلاب سرشک من
وانرا که یار کشت کفن شوی او کنید!
تلقین من که هندوی زنار بسته ام
حرفی ز سحر نرگس جادوی او کنید!
تعویذ دوستی است که اهلیؔ نوشته است
این را بیادگار ببازوی او کنید![۴۳]

اہلی شیرازی کا خاک مصلی میں دفن ہونے کا واقعہ:

اہلی شیرازی کے مدفن سے متعلق بھی ایک دلچسپ واقعہ ملتا ہے کہ لوگ جب اس کے جنازے کو اس کی وصیت کے مطابق حافظ شیرازی کی قبر کے نزدیک دفنانے پہنچے تو مصلی کے متولی نے وہاں دفن کرنے سے انکار کر دیا۔ یہاں تک کہ خواجہ کے دیوان سے فال نکال کر اجازت کی تدبیر کی گئی۔ فال کے مندرجہ ذیل شعر کو دیکھ کر متولی نے مجبوراً دفن کی اجازت دی جیسا کہ سفینہ خوشگو میں تحریر ہے:

"متولی مصلی دفن او را در آنجا قبول نمی کرد
از دیوان خواجه فال گرفتند چون این بیت
بر آمد، چاره ندید:

رواق منظر چشم من آشیانۂ تست
کرم نما و فرود آ که خانه خانۂ تست

بعض بر آن اند که این بیت بر آمده بود:

نیست سر منزل ما منزل هر نا اهلی
هر که اهل ست به سر منزل ما می آید(۴۴)

خواجہ سلمان اور درویش ناصر:

ولایت بخارا کا ایک شاعر درویش ناصر نے حج کے سفر میں بغداد میں ٹھہر کر وہاں کے ایک مشہور درویش سلمان سے ملاقات کرنا چاہی معلوم ہوا وہ دریائے دجلہ کا نظارہ کر رہے ہیں۔ ناصر وہاں پہنچ گیا۔ انہوں نے دریافت کیا: کون ہے؟ اس نے جواب دیا۔ میں

ایک غریب شاعر ہوں۔ یہ سن کر خواجہ سلمان نے فی البدیہہ ایک مصرعہ پڑھا تا کہ ناصر کی شاعری کا اندازہ ہو سکے۔

دجلہ را امسال رفتاری عجب مستانہ است

درویش ناصر نے بھی فوراً مصرعہ ثانی موزوں کر دیا:

پای در زنجیر و کف بر لب، مگر دیوانہ است (۴۵)

خواجہ سلمان بہت خوش ہوئے اور اسے انعام و اکرام سے نوازا۔ سچ تو یہ ہے کہ ناصر کا یہ مصرعہ حسن تعلیل سے مسجع، مہا کات کا التزام لیے ہوئے نہایت خوبصورت ہے۔

شاعر سلطان محمد سلطاںؔ اور علی قلی خان زمان سلطاںؔ کا مطالبہ:

اسی دور میں ایک عجیب واقعہ بدیہہ گوئی کے سلسلے میں نظر نواز ہوا ایک مشہور شاعر سلطان محمد جس کا تخلص بھی سلطان ہی تھا۔ جس کے والد حیدر سلطان اپنے دور کے امرا میں سے تھے۔ خود سلطان اور اس کا بھائی محمد سعید عرف بہادر خاں دونوں ہی ہمایوں بادشاہ کے دور کے امرا میں سے تھے اور دونوں ہی شاعر بھی تھے۔ عبد القادر بدایونی نے ''منتخب التواریخ میں تحریر کیا ہے:

> ''ایک بار سلطان محمد سلطاںؔ نے ایک قصیدہ خان زمان کے پاس بھیجا۔ جس کا تخلص خود بھی سلطاںؔ ہی تھا۔ خان زمان کو یہ قصیدہ پسند آیا اور اس کے صلے میں ایک ہزار روپیہ مع خلعت کے بطور انعام روانہ کر دیا اور ساتھ ہی یہ گزارش بھی کی کہ اپنا تخلص میرے لیے چھوڑ کر کوئی دوسرا تخلص اختیار کر لو۔ سلطان محمد نے یہ کہہ کر وہ

تمام انعام واکرام واپس کردیا کہ میرا نام سلطان محمد ہے اور یہ نام میرے والد کا رکھا ہوا ہے اور اسی تخلص سے شعر کہہ کر میں نے شہرت حاصل کی ہے میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ یہ جواب سن کر خان زمان کو غصہ آ گیا اور اس نے حکم دیا کہ سلطان کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے کچل دیا جائے۔ اس کام کے لیے ہاتھی کو میدان میں بھیج دیا گیا۔ اتفاق سے وہاں مولانا علاءالدین لاری بھی موجود تھے جو خان زمان کے بھائی ہوتے تھے۔ انہوں نے سلطان کی زندگی بچانے کے لیے ایک شرط رکھ دی کہ اگر موجود جامؔی کے دیوان سے نکلنے والے مصرعہ پر پسندیدہ غزل فی البدیہہ موزوں کردیں تو زندگی بخش دی جائے گی دیوان جامی کھولا گیا تو مندرجہ ذیل شعر سرورق دکھائی دیا:

دل خـطـت را رقـم صـنـع الهـی دانسـت
بـه رخ سـاده رخـان حجت شـاهـی دانست

سلطان محمد نے فی البدیہہ شعر موزوں کردیا:

هـر کـه دل را صـدف صـنـع الهـی دانست
قیـمـت گـوهـر خـود را بـه کمـالـی دانست

یہ شعر سن کر خان زمان خوش ہوگیا اور اسے دوگنے انعام واکرام سے نوازا۔(۴۶)

سلطان محمد سلطان اور مولانا قاسم کاہی:

مولانا سید نجم الدین قاسم کاہی اپنے زمانے کے سربرآوردہ افراد میں شمار کیے جاتے ہیں، عہد اکبری میں ہندوستان آئے، اور بہت جلد شہنشاہ کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب رہے۔ان کا ایک قصیدہ (صنعت لزوم فیل میں کہا ہے) بہت مشہور ہوا۔ اکثر شاہی عمارات کی تاریخ کہی ہے۔ ایک موقع پر سلطان محمد سلطان مولانا قاسم کاہی کے پاس گئے تو قاسم کاہی نے سلطان سے غزالی مشہدی کی غزل کے ایک مطلع کے جواب میں شعر کہنے کی فرمائش کی۔سلطان نے فی البدیہہ جواب موزوں کیا۔سلطان محمد کے ان دونوں واقعات کو خوشگو نے اس طرح نقل کیا ہے:

"سلطان محمد سلطان تخلص که از موضع سلک به فتح سین و لام مضافات قندهار بود، ظرفای عوام به کسر سین و لام می خواندند و او را این معنی تر می شد. از شعر و شاعری فراوان بهره داشت. قصیده ای در مدح خان زمان که او نیز سلطان تخلص می کرد، گذرانید. خان زمان هزار روپیه و خلعت در وجه صله فرستاد و التماس نمود که این تخلص را برای خاطر من بگذار. ایشان جایزه و خلعت را رد کرده، گفت که سلطان محمد، نام من است که پدر گذاشته و نیز من پیشتر از شما به چندین سال به این

تخلص شعر گفته ام و شهرت یافته. از او چون توانم گذشت؟ خان زمان برهم بر آمده، فرمود که اگر نگذاری، در زیر پای پیل تو را خواهم انداخت. چنانکه فیل حاضر کردند. مولانا علاء الدین لاری که آخوند خان زمان بود، گفت: غزلی از دیوان مولانا جامی که در مجلس بود درمیان باید آورد. اگر او بدیهةً جواب بگوید، از سر او باید گذشت و اگر نه هر چه اراده باشد اختیار دارند. چون دیوان گشادند، سرورق این غزل بر آمد:

دل خطت را رقم صنع الهی دانست
به رخ ساده رخان حجت شاهی دانست

سلطان محمد بدیهةً گفت:

هر که دل را صدف صنع الهی دانست
قیمت گوهر خود را به کمالی دانست

با آنکه چندان نبود، خان زمان محظوظ شده تحسین فرمود و با اعزاز تمام صله دوچندان فرستاد. از این رهگذر هر جا که می رفت معزز و مکرم بود. وقتی با خدمت سلطان اوباشان مولانا قاسم کاهی رفت و از او پرسید سن

شـریف چـند باشد. قاسم فرمود از خدا دو سال
کـوچـکتـرم! سـلـطان محمد گفت: مخدوم من
شمارا از خدا دو سال بزرگ می دانستم. قاسم
خـنـدید و گفت تو قابل صحبت ما یی. غزل ملا
غزالی مشهدی را که مطلعش این است:

زاهـدا! عـرفـان بـه دلـق و سبحـه و مسواک نیسـت
عشـق پیـدا کـن کـه ایـن هـا داخـل ادراک نیسـت

جواب رسانیده که مطلعش این است:

گــر بــه دل دارد رقیــب از مـا غبـاری بـاک نیسـت
روشـن اسـت ایـن پیش ما کآیینه ی او پاک نیست (۴۷)

جلال الدین محمد اکبر:

نصیر الدین ہمایوں کے بعد اس کا بیٹا جلال الدین اکبر سلطنت مغلیہ کا وارث بنا۔ اکبر ایسا بادشاہ تھا کہ جس نے ہر میدان میں اپنے خاص نقوش چھوڑے۔ کہنے کو تو وہ پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن جاہل نہ تھا۔ اس کا بھی شعری ذوق کسی طور پر بابر و ہمایوں سے کم نہ تھا۔

بادشاہ جلال الدین اکبر اور علی قلی خان زمان سلطان:

فن شعر میں مہارت اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اکبر کو بدیہہ گوئی میں بھی ملکہ حاصل

تھا جس کی کئی مثالیں بزم تیموریہ میں موجود ہیں:

''اکبر کی ایک منظوم خط و کتابت کی بھی مثال ملاحظہ ہو، علی قلی خاں جس کو خان زماں کا خطاب ملا تھا، ہمایوں کے ممتاز امراء میں سے تھا، جون پور کا حاکم بنا کر بھیجا گیا، اکبر کے عہد میں اس نے علم بغاوت بلند کیا، اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے اکبر خود مہم میں شریک ہوا، خان زماں علم پرور ہونے کے علاوہ خود بھی شاعر تھا، سلطان تخلص کرتا تھا، اس نے سخت لب ولہجہ میں اکبر کے پاس یہ رباعی لکھ بھیجی:

ای سد سکندر زمانہ در تو
یاجوج بود سپاهی لشکر تو
در دور تو آثار قیامت پیدا ست
دجال لوئی خواجه امینا خر تو

اکبر نے اپنے حریف کو اسی انداز اور درشتی میں جواب دیا:

ای خان زمان که پر بود لشکر تو
شد دولت من باعث کر و فر تو
کمتر باشم ز خر دجال امروز
فردا من اگر جدا نسازم سر تو

خان زماں نے پھر لکھ بھیجا:

تا هست اثر خالصه در کشور تو
مشکل که بمن جنگ کند لشکر تو
بگذرد زر و سیم که تا نوکر تو

از سر گذرد برای سیم و زر تو

اکبر کا جواب تھا:

با آنکه بود خاک درم افسر تو
امروز بمن فرو نیاید سر تو
از دولت من هست ترا سیم و زری
وز زور زر است قدرت لشکر تو

خان زماں شاہی مقابلہ کی تاب نہ لا سکا، بالآخر اس نے سپر ڈال دی اور معذرت پیش کی:

ای شاه زمان منم مکین نوکر تو
وز ترس نمی توانم آمد بر تو
از دور تو قصد کشتن من داری
نزدیک چسان توانم آمد بر تو

اکبر نے خان زماں کو معاف کر دیا اور لکھا:

گفتی چو راستی خدایا در تو
صد رحمت حق بر پدر و مادر تو
تغییر مده تو سکه و خطبه من
تا من نکنم آرزوی کشور تو (۴۸)

مولانا شبلی نعمانی کی اکبر کے بارے میں رائے:

شبلی نعمانی بھی اکبر کی برجستگی کے قائل نظر آتے ہیں، فرماتے ہیں:

''اکبر نے بارہا اساتذہ کے اشعار پر نکتہ چینیاں بھی کی ہیں
اور نقادانِ فن نے اس کی تنقیدوں کی داد بھی دی ہے، ایک بار
محفل نغمہ وسرور میں اس کے سامنے فغانی کا یہ شعر پڑھا گیا:

مسیحا یار و خضرش هم رکاب و هم عنان عیسیٰ
فغانی آفتاب من بدین اعزاز می آید

اکبر نے دوسرے مصرع میں برجستہ اصلاح دی:

فغانی شهسوار من بدین اعزاز می آید (۴۹)

باباطالب اصفہانی کی رباعی پر اکبر کی اصلاح:

اسی طرح ایک موقع پر باباطالب اصفہانی کی حسب ذیل رباعی پڑھی گئی، جس میں حکیم ابوالفتح گیلانی کی موت پر افسوس اور اس کے بھائی حکیم ہمام کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا گیا تھا:

هر دو برادرم که دم ساز آمد
او شد به سفر وین ز سفر باز آمد
او رفت بدنباله او عمر برفت
وین آمد و عمر رفته ام باز آمد

اکبر نے اس رباعی کو سنا تو کہا کہ دنبالہ کے لفظ سے شعر میں گرانی
پیدا ہوگئی ہے اس لیے یہ مصرع اس طرح پڑھا جائے تو بہتر ہے:

او رفت وز رفتنش مرا عمر برفت'' (۵۰)

نوٹ: مذکورہ رباعی کے مصرع اولیٰ میں کوئی لفظ ''هـــر دو'' کے بعد لکھنے سے رہ گیا ہے جو کہ غالباً ''چون ''یا ''که'' جیسا کوئی لفظ ہونا چاہیے۔

ابوالفضل علامی کا قتل اور اکبر کا ردعمل:

اکبر، اپنے بیٹے اور ولی عہد نورالدین جہانگیر کے اشارے پر ابوالفضل علامی کے قتل ہونے پر نہایت غمگین و حیران ہوا۔ اس کا یہ جملہ '' کاش ابوالفضل کی جگہ مجھے قتل کر دیا جاتا'' اس کی حالت کی عکاسی کرتا ہے اس واقعے کو بزم تیموریہ میں اس طرح رقم کیا گیا ہے:

''۴۵رویں سال جلوس میں ابوالفضل قلعہ اسیر کی فتح کے لیے بھیجا گیا، اس کے ساتھ مرزا عزیز کوکہ، آصف خاں جعفر اور شیخ فرید بخشی بھی تھے اور خاندیس کی حکومت بھی اس کے سپرد کی گئی، یہ قلعہ ابوالفضل کی نگرانی میں فتح ہوا۔ اسیر کی فتح کے بعد اکبر نے ابوالفضل کو ناسک کی مہم پر تعینات کیا لیکن ناسک جانے کے بجائے وہ پھر احمد نگر کی طرف بھیج دیا گیا، جہاں جا کر اس نے فوج کی کمان سنبھالی اور یہاں سے اپنے ۴۷رویں سال جلوس میں اکبر نے اس کو آگرہ طلب کیا اور جب وہ آ رہا تھا تو راستہ میں شہزادہ سلیم کے اشارے سے ہرسنگھ دیو نے اس کو قتل کر دیا، جب اس حادثہ کی خبر دارالحکومت میں پہنچی تو اس سانحہ کی خبر اکبر تک پہنچانے کی کسی میں ہمت نہیں ہوئی، آخر کار ابوالفضل کا وکیل سیاہ لباس پہن کر دست

بستہ اکبر کے حضور میں آیا، ابوالفضل کے وکیل کو جب اکبر نے
دیکھا تو متحیر ہو گیا، خبر جانکاہ سن کر فرط غم سے نڈھال ہو گیا اور
بولا کہ اگر شہزادے کو بادشاہت چاہیے تھی تو مجھ کو قتل کر دیتا اور
شیخ کو چھوڑ دیتا اور پھر یہ شعر پڑھا:

شیخ ما از شوق بی حد چون سوی ما آمده
از اشتیاق پای بوسی بی سر و پا آمده (۵۱)

اکبر، شاہ عباس اور فیضی کی رباعی:

یہی وجہ ہے کہ اس کے دربار اور اس کے زمانے جیسے شاعر کسی دوسرے دربار یا زمانے میں دکھائی نہیں دیتے اکبر نے ملک الشعراء کا خاص عہدہ ایجاد کیا جس پر پہلے غزالی اور اس کی موت کے بعد فیضی کو سرفرازی ملی۔ فیضی دربار اکبری کا ملک الشعراء بنا، حاضر جوابی میں اس کی کوئی مثال نہ تھی۔ بزم تیموریہ میں فیضی کے فی البدیہہ شعر کہنے کے واقعے تحریر کئے گئے ہیں ایک جگہ مندرجہ ذیل واقعہ قلمبند کیا گیا ہے۔

''ایران میں اکبر کا معاصر حکمراں شاہ عباس صفوی تھا، دونوں میں بڑی یگانگت رہی، دونوں ایک دوسرے کو قیمتی تحائف بھیجا کرتے تھے، ایک بار شاہ عباس صفوی نے ایک صفیر بھیجا، تو اس نے اکبر کے دربار میں آ کر اپنے آقا کا ایک مکتوب پڑھا۔ جس کے سرورق یہ رباعی درج تھی۔

زندگی به سپاه و خیل و لشکر نازد
رومی به سنان و تیغ و خنجر نازد

اکبر بہ خزینہ پراز زر نازد
عباسؑ بہ ذوالفقارِ حیدرؑ نازد

نوٹ: (مندرجہ بالا رباعی زندگی' لفظ سے شروع ہوتی ہے۔ جو غلط ہے یہاں کوئی اور لفظ لکھا گیا ہوگا۔ جسے مصنف نے زندگی میں بدل دیا۔)

دربار میں جب یہ رباعی پڑھی گئی تو ہر شخص چونک اٹھا، اکبر نے فیضی کی طرف دیکھا جو اپنے محبوب شاہی آقا کی سبکی برداشت نہ کرسکا، فی البدیہہ یہ رباعی کہہ کر پڑھی:

فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد
دریا بہ گھر فلک بہ اختر نازد
عباسؑ بہ ذو الفقار حیدرؑ نازد
کونین بہ ذات پاک اکبر نازد

اس کو سن کر دربار میں مسرت وافتخار کی ایک لہر دوڑ گئی۔'' (۵۲)

فیضی کا سفر دکن:

فیضی کو بدیہہ گوئی میں مہارت حاصل تھی۔ یہاں اس کے اس فن میں طاق ہونے کی ایک اور مثال شعرالعجم حصہ سوم کے حوالے سے پیش کی جاتی ہے۔

''دکن کے سفر میں ایک دفعہ کچھ ہنگامہ ہوا۔ لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ فیضی نے بہت روکا۔ کسی نے نہ سنا تو اس وقت بے اختیار اس کی زبان سے یہ غزل ادا ہوئی:

باز یاران طریقت سفری در پیش است
رہ نوردان بلا را خطری در پیش است

کس نمی گویدم از منزل اول خبری
صد بیابان بگذشت و دگری در پیش است

هم رهان این همه نومید نباشد از من
که دعای سحرم را اثری در پیش است

ما نه آنیم که نا دیده قدم بگذاریم
شکر کن قافله را راهبری در پیش است

ای صبا! بر سر آفاق گل مژده بریز
که شب تیره مارا سحری در پیش است

فیضیؔ از قافله کعبه روان بیرون نیست
این قدر هست که از ما قدری در پیش است (۵۳)

اس فی البدیہہ غزل سے اس ہیبت ناک واقعے اور فیضی کی بیکسی کا پورا نقشہ نظر نواز ہو جاتا ہے۔

ملا عبدالقادر بدایونی کی بدیہہ گوئی:

منتخب التواریخ کا مصنف ملا عبدالقادر بدایونی خود بھی شاعر تھا نہایت ذہین اور اپنے آپ میں نہایت سخت، بدیہہ گوئی میں اس کے اثرات بھی جگہ جگہ ثبت نظر آتے ہیں وہ خود اپنی تاریخ میں رقم طراز ہے:

''میں اس کی روانگی کے تیسرے دن لاہور سے شیر گڑھ پہنچا اور حضرت موصوف کی خدمت میں چار دن تک رہا۔ میں نے وہاں جو انوار و فیوض دیکھے اور سنے ان کا اس سے پہلے میں تصور تک نہیں کر سکتا تھا میں نے اس سلسلے میں فی البدیہہ چند

شعر کہے تھے جسے حضرت نے پسند فرمایا وہ شعر یہ ہیں:

ای منزہ نسبت ایجاد تو از ماء و طین
ذات پاک چون پیمبرؐ رحمة للعالمین

هست اسم اعظمت داؤد از تاثیر آن
چون سلیمان جن و انس آمد ترا زیر نگین

قم وجیه اللہ یقین من نمی شد سالها
روی تو دیدم عیان شد نکتۂ عین الیقین(۵۴)

مولانا قاسم کاہی:

مولانا سید نجم الدین قاسم کاہی اکبری دور کا مشہور قصیدہ گو اور تاریخ گو شاعر ہے۔ بدیہہ گوئی میں بھی اس کا ایک الگ مقام ہے۔ ایک بار وہ خیرآباد میں بیمار ہوا تو خواجہ معظم پاؤں میں تکلیف ہونے کے باوجود اس کی عیادت کے لیے آئے تو اس نے فی البدیہہ ایک غزل کہہ کر اس کا ترنم بھی بنادیا:

ماندی قدم زنانہ بر دل نیاز من
درون مباد پای ترا سرو ناز من
هر چند وصف وصل تو کردم شب فراق
کوتہ نگشت قصۂ ورد دراز من(۵۵)

محبت وانکساری کی جھلک اس غزل سے بہت واضح ہے۔

اکبراور میرزامنوہرکاواقعہ:

اکبر کے ہی زمانے میں محمد منوہر نام کا ایک نہایت خوبصورت اور ذہین شاعر تھا اس کا تخلص کاستی تھا جب بادشاہ نے اسے میرزامنوہر کا خطاب دیا تو اس نے برجستہ مندرجہ ذیل اشعار موزوں کیے:

شربت آشا ماميا در بزم ما دردی نشان
کز جگر در کف کباب و خون دل در ساغر است
ننگ مردان است حرف از جان و دل گفتن به عشق
دل چو خون سخت بسته جان چو باد صرصر است
توسنی سرده سمند شوق در میدان عشق
می رسی ایمن به مقصد رهبرت چون اکبر است(۵۶)

ان اشعار سے کاستی کی جودت طبع اور کمال شعر میں مہارت خاص کر بدیہہ گوئی کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔

میرزاجعفرآصف خان:

میرزاجعفرآصف خان ایرانی شاعر تھا۔ جوانی کے عالم میں ہندوستان آیا۔ اپنے چچا مرزاغیاث الدین کی مدد سے اکبر بادشاہ کی طرف سے دوبیستی منصب پر سرفراز ہوا تو فوراً بطور شکریہ یہ شعر سنایا:

"من و داخلی وانگهی بیستی
که مادر مبنیاد این نیستی"(۵۷)

یہاں دوبیستی منصب کی طرف اشارہ اس کی ذہانت کی داد چاہتا ہے۔

ابوالفضل کے خاندان کا روپوش ہونا:

یوں تو فیضی اور اس کے بھائی ابوالفضل کا شمار اکبر کے نورتنوں میں ہوتا ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب ان کے خلاف حاسدوں ومفسدوں کی چغلخوری نے رنگ دکھایا اور اکبر کی ناراضگی کو دیکھتے ہوئے انہیں اکبرآباد کو خیر باد کہنا پڑا یہاں تک کہ بھیس بدل کر چھپتے چھپاتے ادھر ادھر دوڑنے بھاگنے لگے۔ اس مصیبت اور پریشانی کا حال ابوالفضل نے آئین اکبری میں درج کیا ہے:

"نورستان آفتاب و تاریک های بدگوهر و هجوم مسالک شهر، و هنگامه پژوهندگان نا فرجام، و یاور نا پدید، و یار انداز نا یافت، قلم چوبین را کی یارا که قدر ازان حال گذارد"(۵۸)

آخر کار لوٹ کر دوبارہ اکبرآباد میں آئے اور ایک دوست کے گھر دو مہینے تک رہے اور ۹۷۴ھ میں جب شاہی تقریب ہوئی تو اکبر نے دوبارہ بڑے احترام سے بلایا لیکن ابوالفضل خود تو نہ گئے البتہ فیضی پہنچے اور کامیاب واپس آئے۔ فیضی کو دیکھ کر ابو الفضل پر غم وخوشی کی ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی جسے ابوالفضل نے "آئین اکبری" میں اس طرح رقم کیا ہے:

''شیخ را بـا پیشگاه خلافت رسانیدند و با طرز دل کشـا و آئینـه عـاطـفت افزا عرض داشتند اورنگ نشیـن اقبـال آرا و مـقتـضای دوربینی و قـدر شـناسی پاسخ های مهر آلود گذارش فرمود و از راه مـردمـی و بـزرگـی طـلـب داشت، چون مراسر با تعلق فر و نیامدی همراهی نگزیدم و آن پـر نـورانـی بـا مهیـن برادر روی نیـاز بـا درگـاه هـمـایـون آورد و بـا گونه گون نوازش بادشاهانه پـایـه والا یافت.و یکبارگی زنبور خانه نا سپاسان خـمـوشیـد و عـالـم بـر هم خورده آرام گرفت و هـنگامه درس و خلوت گاه مقدس را ازین بستند و زمانه آئین نیکوان پیش آورد.

﴿رباعی﴾

ای شـب نـکـنـی آن هـمه پرخاش که دوش
راز دل مـن مـکـن چنـان فـاش کـه دوش
دیــدی چـــه دراز بــود دو شیـن شبـم
ای شـب وصـل آن چـنـان بـاش کـه دوش

و هـم دریـن نـزدیکی که پدر بزرگوار با مطاف حـضـرت دهـلـی تـوجه فرمود و مرا با بی رخی مستفیذان محفل قدسی همراه گرفت''۔(۵۹)

برجستہ کہی ہوئی یہ رباعی پورے واقعے کا احاطہ کیے ہوئے ہے جس سے فیضی وابوالفضل کی دربار میں اہمیت اور اکبر کی رحم دلی وفیاضی کا اندازہ ہوتا ہے۔

نورالدین محمد سلیم جہانگیر:

جلال الدین اکبر کے بعد اس کا بیٹا نورالدین جہانگیر سلطنت مغلیہ ہند پر جلوہ افروز ہوتا ہے۔ جہانگیر کا جمالیاتی ذوق اپنے گذرے ہوئے اجداد سے بڑھ کر تھا۔ وہ دنیا کی ہر شے کو نہایت باریک بینی سے دیکھتا۔ تزک جہانگیری کا مطالعہ کرنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ جہانگیر کی جستجو اور تخیل کی پرواز کس منزل پر تھی۔ وہ زندگی کے ہر شعبے کو بڑی تیکھی نظر سے دیکھتا اس کا مشاہدہ نہایت قوی تھا۔ اس کا شعری ذوق بھی کسی شاعر سے کم نہ تھا۔ وہ صنف شاعری کی تمام باریکیوں سے بہرہ ور بھی تھا اور شعر پر اسی طرح سے نظر ڈال کر فوراً تبصرہ بھی کرتا تھا۔ طالب آملی اس کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔

طالب آملی اور جہانگیر:

ملک الشعراء بننے سے پہلے کا ایک واقعہ شعرالعجم میں قلمبند کیا گیا ہے۔ جس سے طالب آملی کے فی البدیہہ شعر کہنے کی مہارت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

> ''دیانت خاں جو جہانگیر سے خاص تقرب رکھتا تھا۔ جہانگیر کے سامنے اس نے طالب آملی کی اس قدر تعریف کی کہ جہانگیر نہایت مشتاق ہوا۔ اور دربار میں دیانت خاں اسے خود ساتھ لے کر گیا۔ لیکن طالب نے بیوقوفی یہ کی کہ نشہ آور'' معجون

مفرح'' کا استعمال کرلیا جس سے اس کے حواس جاتے رہے۔ جہانگیر نے نہایت مہربانی سے باتیں کرنا چاہیں مگر وہ پتھر کی تصویر بنا رہا۔ دیانت خاں کو سخت شرمندگی ہوئی۔ طالب گھر واپس آ کر جب ہوش میں آیا تو فوراً ستاون (۵۷) اشعار پر مشتمل ایک قطعہ موزوں کرکے دیانت خان کی خدمت میں روانہ کیا جس کے اشعار اس طرح ہیں۔

چه لطفها که نمودی و می نمایی نیز
به هر غریب و مسافر علی الخصوص به من
نخست آن که چو در غربتم نظر کردی
به مهر بردی، از خاطرم هوای وطن
چهارم آن که به بزم شهنشهم بردی
چو دل به پهلوی خود ساختی مرا مسکن
به بادشاهم سرگرم گفت و گو کردی
به مهر دیدمی خفاش را حریف سخن
تو آنچه باید وگردی و لیک طالع شوم
بدستیاری گردون نفاق زد با من
به بست نطق مرا بخت بد و زان بستن
کشود بر من، هم دوست طعنه هم دشمن
کرا گمان که چو من استعاره پردازی
به صد زبان فصاحت بیان شود الکن

کـرا گـمـان کـه فتـد رشتـه کـلام مـرا
چـو تـار زلف عـروسـان شـکـن بـروی شـکـن
ازیـن قیـاس نـما، غـور کـن، کـه قـدرت کیست؟
بـه یک دو لـحـظـه چـنین قـطعـۂ ادا کـردن
دو چیـز مهـر زبـان سـخـنـوری گـردیـد
مـرا بـه بـزم شهـنشـاه خـوش عیـار سـخن
یـکـی زبـونـی طـالـع کـه دایـم از اثـرش
بـه هـر دیـار قـریبم بـه گـونـه گـونـه مـحن
دگـر زیـادتـی نشـۂ کـه نـامـش را
نـمـی تـوانـم از یـن شـرم بـر لـب آوردن
ادا صـریـح کـنـم تـا گـمـان مـی نبـری
چـرا کـه شستـه ام از وی بـه هـفـت آب و دهـن
مـفـرحـی زده بـودم بـه قـصـد گـفتـن شـعـر
عـروج نشـه آن کـرد هـرچـه کـرد بـه مـن
بـه بـزم بـادشهـم زان زبـان نـمـی گـردیـد
کـه گشتـه بـود مـرا خشک از زبـان و دهـن
سـخـن شـنـاسـا! پیـش تـو چـون بـر آرم سـر
کـز انـفـعـال سـرم غـوطـه خـورد در گـردن
نـه کـرده جـرم مـرا عـفـو کـن بـه لـطف عـمیـم
کـه خـوش نـمـا است خـطـایی نـه کرده بخشیدن

من ار چہ بیگنہم بخت من گنہ گار است
گناہ بخت مرا لطف کن، بہ بخش بہ من (۶۰)

جہانگیر کی بدیہہ گوئی:

جہانگیر کی بدیہہ گوئی پر مولانا شبلی نعمانی نے مندرجہ ذیل تبصرہ کیا ہے:
ایک دفعہ خانخانان نے یہ غزل طرح کی:

بھر یک گل رحمت ھر خار می باید کشید

مرادصفوی اور مرزا نے بھی اس طرح میں غزلیں لکھیں۔طرح کا مصرع چونکہ نہایت شگفتہ تھا جہانگیر نے فی البدیہہ یہ مطلع کہا:

ساغر می بر رخ گلزار می باید کشید
ابر بسیارست می بسیار می باید کشید (۶۱)

اس فی البدیہہ مطلع سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہانگیر اگر شاعری کے میدان میں پوری طرح اترتا تو اس کا شمار اس دور کے بہترین شاعروں میں کیا جاتا۔

جہانگیر اور نور جہاں کی بدیہہ گوئی:

جہانگیر خود فی البدیہ شعر کہنے اور برجستگی میں اپنی مثال آپ تو تھا ہی سونے پہ سہاگا یہ کہ اس کی ملکہ نور جہاں بھی کسی طور صلاحیتوں میں اس سے کم نہ تھی۔ترکی بہ ترکی جواب دینے میں اسے کمال حاصل تھا۔جہانگیر کو اس کے ساتھ خوش گپیاں اور شوخیاں کرنے میں بھی مزہ آتا تھا۔اور جہانگیر اس کی باتیں سن کر خوش ہوتا اکثر یہ بھی ہوتا

کہ کسی واقعہ یا حادثے پر جہانگیر کوئی فی البدیہ مصرعہ کہتا اور نور جہاں بیگم اس مصرعہ پر بر جستہ مصرعہ ثانی لگا کر اسے شعر بنا دیتی۔ تاریخ حسن اور تاریخوں میں ان دونوں کے کئی ایسے شعر درج ہیں یہاں سفینہ خوشگو سے ان دونوں کی برجستگی اور فی البدیہہ شاعری کا مزہ لیا جا سکتا ہے مشہور ہے کہ جہانگیر رات کو شراب میں ڈوب جاتا لیکن رمضان کے مہینے میں رمضان کی حرمت کا خیال رکھتے ہوئے شراب نوشی بالکل نہیں کرتا تھا۔ لیکن عید کا چاند دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھل اٹھتی تھیں ایک بار کا ایک ایسا ہی واقعہ سفینہ خوشگو میں درج ہے:

"منقول است که وقتی به مجرر معانیه ماه عید از غایت شوق شراب، این مصرعه بر زبان راند:

هلال عید بر اوج فلک هویدا شد

نور جهان بیگم نیز که طبع موزون داشت، بدیهه مصرعه ثانی رسانید.

کلید میکده گم گشته بود و پیدا شد. (۶۲)

تاریخ حسن میں نور جہاں اور جہانگیر کے ذہنی اختراع کا موازنہ اس طرح کیا گیا ہے:

جهانگیر شاه مردی ساده و سست طبیعت و متلون المزاج بود طبعی دزدن داشت. شعرهای سنجیده می گفت لیکن نور جهان شعله ذکا بود. در سخنوری و رمزشناسی نظیر نداشت. و در اسپ دوانی و قبق اندازی و شکار افگنی بسیار جرار بود. وقتی در شکارگاه بدست خود شیری شکار

کرد. ظریفی این مطلع گفت:

نور جهان گر چه بصورت زن است

در صف مردان زنِ شیر افگن است

احداث لوازمات آرایش زنان و ابداع زیورات از مخترعات او مشهور است و عطر گلاب از گل افشانی او معروف در حاضر جوابی و سخن دانی در ها می سفت.(۶۳)

اسی طرح بدیہہ گوئی میں جہانگیر اور نور جہاں کے کئی اشعار نظر نواز ہوئے ہیں کہ اگر کسی واقعے پر ایک مصرع جہانگیر نے سنایا تو فوراً ہی اس پر دوسرا مصرع نور جہاں نے لگا کر شعر پورا کیا۔ ایک بار جہانگیر نے ایک مصرع پڑھا:

سرو در باغ به یک پای ستاده است نگر

نور جہاں نے فوراً دوسرا مصرع لگایا:

با رکاب تو دود گر بودش پای دگر

اس کے بعد جہانگیر نے ایک مصرع اور پڑھا:

سوارا شرم می آید به روی گل نگه کردن

نور جہاں نے اس مصرع کو سنا اور فوراً دوسرا مصرع لگا کر شعر کو پورا کر دیا:

که رخت غنچه وا کرده است نتوانست ته کردن(۶۴)

ایک دن کا واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ یہ دونوں شب بیداری میں مشغول تھے یعنی نیند آنکھوں سے غائب تھی کہ جہانگیر نے ایک مصرع گنگنایا:

از شب چه قدر گذشته باشد

نور جہاں نے مصرع سنا مصرع ثانی لگا کر شعر مکمل کیا:

زلفش ز کمر گذشته باشد (۶۵)

ایک دن کا واقعہ ہے کہ بادشاہ کوہ سلیمان کی سیر کے لیے نکلا وہاں پر نور جہاں بیٹھی ہوئی خود حلوا بنا رہی تھی بادشاہ نے اس کو دیکھا اور مسکرا کر کہا:

شکر فروش من پئی حلوا گری نشست

نور جہاں نے فوراً ہی دوسرا مصرع لگا کر شعر مکمل کر دیا:

یعنی که زیر تخت سلیمان پری نشست

اسی طرح جہانگیر نے ایک بار مصرع موزوں کیا:

نرگس زده بُر سر و از فرق تو آن شوخ

نور جہاں نے برجستہ دوسرا مصرع لگا کر شعر مکمل کر دیا:

کج کرده سر خویش تا روی تو ببیند (۶۶)

اکثر جہانگیر کے مصرعوں پر مصرع لگا کر نور جہاں شعر مکمل کرتی رہتی تھی اس ذیل میں جہانگیر نے ایک مصرع نور جہاں کو سنایا:

نیست نرگس که بود بر سر من افسر من

نور جہاں نے فوراً ہی مصرع لگا کر شعر کو اس طرح مکمل کر دیا:

به تماشای تو بیرون شده چشم از سر من (۶۷)

اسی طرح کے بہت سے واقعات تذکروں اور تاریخوں میں ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں جن سے نور جہاں اور جہانگیر کی بدیہہ گوئی اور شعر فہمی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

نور جہاں اور طالب آملی:

بدیہہ گوئی میں نور جہاں بھی اپنا جواب آپ تھی۔ طالب آملی جو دربار جہانگیری میں ملک الشعراء تھا اور جہانگیر کی شان میں برابر قصائد لکھتا رہتا تھا۔ ایک دن نور جہاں نے اس سے کہا تم نے جہانگیر کی تعریف میں بہت سے قصیدے لکھے ہیں لیکن میری مدح میں ایک شعر بھی نہیں موزوں کیا ہے۔ طالب نے جواب دیا جس کو میں نے ابھی تک دیکھا ہی نہیں ہے اس کی توصیف کس طرح کرسکتا ہوں یہ سن کر نور جہاں نے فوراً ایک قطعہ موزوں کیا۔ یہ واقعہ تاریخ حسن میں موجود ہے:

"روزی طالب آملی را گفت که در مدح پادشاه ایشان قصائد بسیار گفته اند و در مدح من یک بیت هم موزون نکردند. طالب گفت کسی گاهی بچشم ندیده باشد توصیف او چگونه گفته شود نورجهان بدیهه گفت :قطعه

بلبل از گل بگذرد گر در چمن بیند مرا
بت پرستی کی کند گر برهمن بیند مرا
در سخن پنهان شدم مانند بو در برگ گل
هر که دارد میل دیدن در سخن بیند مرا(۶۸)

ملا شیدا:

اسی دور میں ملا شیدا فن بدیہہ گوئی میں ماہر ایک شاعر ہوا ہے۔ خوش گو اس کے بارے میں لکھتا ہے:

"در اواخر به زمرهٔ بنده های شاهجهانی در آمد. در عهد جهانگیری و شاهجهانی هیچ کس با او برابر نمی توانست شد. خیلی کثیف وضع و تند خو و حاضر جواب و هجو گو بود لطیفه او از هر قسم مرقوم می گردد". (٦٩)

اس نے تفنگ شاہ جہانی کے بنائے جانے پر ایک رباعی تحریر کی تھی، بقول خوشگو:

و در وصف تفنگ خاصه شاهجهانی، وقتی که خود به دولت در باغ گلی را هدف ساخته، سر داده بودند، بدیهة این رباعی گفته:

چون کرد طلب قبله ارباب ز من
آن افعی اژدر دهن رویین تن
گل را چو نشانه ساخت در صحن چمن
رنگ از رخ گل ربود و زنگ از دل من (٧٠)

جہانگیر اور اس کا ہم زلف قاسم خاں:

اسی دور میں قاسم خاں جو اتفاق سے نور جہاں کا بہنوئی ہونے کی بنا پر جہاں گیر کا ہم زلف بھی تھا۔ اکثر شاہ جہاں کے ساتھ خوش گپیوں میں شریک رہتا۔ بدیہہ گوئی میں اچھی مہارت رکھتا تھا۔ یہاں کمالات الشعراء سے اس کی بدیہہ گوئی کی مثالیں پیش کی جا رہی ہیں:

"روزی بادشاه آب خاصه طلبید، و پیاله گلی بغایت نازک آوردند. همین که بدست گرفت،از جنبش آب بشکست ،بادشاه این مصرع بدیه بر زبان مبارک راند:

کاسه نازک بود آب آرام نتوانست کرد

قاسم خان بدیهةً پیش مصرع رساند:

دید حالم را و چشمش ضبط اشک خود نکرد

و همچنین در شکارگاه، پادشاه این مصرع فرمود:

چینهٔ پادشاه زد کاله

یعنی بوز خاصه، آهوی سیاه را افکنده، قاسم خان گفت:

گشت صحرا ز خون پر از لاله

دیوان مختصری دارد. با نورجهان بیگم مشاعره

داشته، نوبتی بیگم در این غزل امتحان طبع وی نمود
و وی از عهده آن بر آمد:
گــر ســر ســایــه نشین روزی بـه تخـت بـاغبـان
ســایـــه بـــر خـــورشیـد انـدازد درخـت بـاغبـان

فـاختــه چـون دیـد بـی گل بـا غ را نـالید و گفـت
از چــه رو بـا گـل نـرفـت این جـان سخـت بـاغبـان

جشـــن نـــوروز اســـت و فـــراش بهـــار از فیـض طبـع
طـرح کـرد از سبـزه و گـل تـاج و تخت بـاغبـان (۷۱)

جہانگیر کی اپنی بدیہہ گوئی پر رائے:

جہانگیر کو اپنے اس فن کا احساس اچھی طرح تھا جس کا اظہار اس نے ''توزک جہانگیری'' میں کیا ہے۔ ایک تقریب میں امیر الامرا کا ایک شعر اس کے سامنے پڑھا گیا جسے سننے کے بعد وہ ''جشن هفتمین نوروز'' کے تحت لکھتا ہے:

''یـکـصـد و شـصـت زنـجیر فیل نر و ماده اسلام
خـان از بـنـگـالـه فرستاده بود در همین روزها از
نـظـر گـذشـت و داخـل فیـل خـانـه خاصه شریفه
گشـــت راجـــه نیک چـنـد کـمـــایون استدعـای

رخصت نمود چون به پدر او در زمان عرش
آشیانی یکصد راس اسپ مرحمت شده بود به
همان دستور مرحمت کردم وفیل نیز داده شد به
تقربی این بیت امیر الامرا خوانده شد:

بگذر مسیح از سر ما کشتگان عشق
یک زنده کردن تو به صد خون برابر است

چون طبع من موزون است گاهی بی اختیار
مصراعی و رباعی یا بیتی در خاطرم سر می زند
این بیت زبان گذشت:

از من متاب رخ که نیم بی تو یک نفس
یک دل شکستن تو به صد خون برابر است

چون خوانده شد هر کس که طبع نظمی داشت
درین زمین بیتی گفته گذرانید ملا علی احمد مهر
کن که احوال او پیش ازین گذشت بد نگفته بود:

ای محتسب ز گریه پیر مغان بترس
یک خم شکستن تو به صد خون برابر است (۴۲)

مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ جہاں گیر کی بزم میں بدیہہ گوئی کا التزام اکثر ہوتا رہتا تھا۔

شہاب الدین محمد خرم شاہ جہاں:

جہانگیر کے انتقال کے بعد اس کے جانشین کی شکل میں صاحب قرآن ثانی شاہ جہاں ہندوستان کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔شاہ جہاں خود شاہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تمدن کا اہم علمبردار بھی بنا۔تاج محل جیسی خوبصورت عمارت شاہ جہانی دور کے لئے ہی نہیں بلکہ ہر دور کے لئے محلوں کا تاج ہے۔اسی لئے اس کا نام تاج محل رکھا گیا ہے۔

ابوطالب کلیم:

شاہ جہاں نے اکبر و جہانگیر کی روایت کے مطابق ملک الشعراء کا عہدہ برقرار رکھا جس پر ابوطالب کلیم جلوہ افروز رہا۔فی البدیہہ شعر کہنے میں بھی اسے مہارت حاصل تھی۔شعرالعجم میں اس کے فن کا مظاہرہ اس طرح کیا گیا ہے خان جہاں لودی نے جب بغاوت کی اور شکست کھا کر مقتول ہوا تو اس کا اور اس کے شریک بغاوت دریا خان کا سر ایک ساتھ دربار میں آئے تو یہ منظر دیکھ کر کلیم نے فی البدیہہ رباعی کہی۔سفینۂ خوشگو میں اس واقعے کو اس طرح ضبط تحریر میں لایا گیا ہے:

"در حینی که بیرا خان جهان لودی باغی شده بود، به دریا روهیله پیوست، اول دریا کشته و بعد از آن بیرا و دو برادر رشید او به قتل رسیدند و سرهای هر چهار مقتول به درگاه پادشاهی آمدند. لفظ "چهار سر" تاریخ این واقعه یافت. صنعت آن است

کہ اعداد لفظ سر را از چهار بار شمارند و نیز این رباعی مبارکباد گذرانید:“

این مژده فتح از پی هم زیبا بود
این کیف دو بالا چه نشاط افزا بود
از کشتن ”دریا“ سر ”ببرا“ هم رفت
گویا سر آن حباب این دریا بود (۷۳)

یہ واقعہ ۱۰۴۰ھ کا ہے۔جیسا کہ فی البدیہہ موزوں کی گئی تاریخ ”چھار سر“ یعنی چار بار سر کو ابجد کے ساتھ شمار کرو۔”سر“ یعنی ۲۶۰ تاریخ ۴x۲۶۰=۱۰۴۰ھ سال واقعہ برآمد ہوتا ہے۔

”شاہ جہاں“ نام رکھنے پر شاہ روم کا اعتراض اور کلیم کی حاضر جوابی:

کلیم حاضر جوابی میں اپنا جواب آپ تھا شاہجہاں کے ساتھ اکثر برجستہ شعر کہہ کر سنانا اس کا خاص شیوہ تھا۔شاہ جہاں بادشاہ بننے سے قبل خرم کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس کا نام شہاب الدین تھا۔لیکن جس دن تخت پر جلوہ افروز ہوا اس نے اپنا نام شاہ جہاں رکھ لیا۔جب یہ بات شاہ روم کو معلوم ہوئی تو اس نے اپنے ایلچی کے ذریعے خط روانہ کیا جس میں لکھا کہ تم تو صرف ہندوستان کے بادشاہ ہو اپنے آپ کو دنیا کا بادشاہ کیوں کہلواتے ہو”شاہ جہاں“ سے مراد ہے جہاں کا شاہ یعنی دنیا کا بادشاہ، یہ نام تمہارے لئے زیب نہیں دیتا۔اس نے یہ بھی لکھا کہ تمہارے لئے بہتر نام عبداللہ،عبدالرحمٰن یا عبدالرحیم ہیں تمہیں چاہیے کہ تم انہیں میں کوئی بھی نام اختیار کرو۔شاہ جہاں نے اپنے وزیر خاص آصف خان سے مشورہ کیا تو اس نے اس خطاب کو بدلنے کا مشورہ دیا۔

”نقل مشهور است که خوندگار روم در تهنیت جلوس نوشت: شما که شا ه جهان بادشاه لقب کرده ای،چون پادشاهی ایران وتوران همه داخل جهان است ومتعلق به شما نیست ، لهذا مناسبت ندارد. از آنجاکه بهترین اسما نزد خدا ورسولؐ‘ عبدالله و عبد الرحمٰن و عبد الرحیم است‘ می باید ازین عالم لقب نهاد. بادشاه بعد ازمطالعه با آصف خان مشورت نمود که خطاب را تغیر باید داد .استاد کلیم خبر یافته، همان شب قصیده ای سرانجام داد و درتصدیق این معنی بیتی گفت که بسیار مستحسن افتاد.همان بیت درجواب قیصر نوشت و اورا به زر کشیدند.“ (۷۴)

هند و جهان زروی عددچون برابر است

بر شه خطاب شاه جهان زان مقرر است‘‘

یعنی ابجد کہ حساب سے ’’ہند‘‘ کے 59 عدد ہوتے ہیں۔اور 59 ہی عدد ’’جہان‘‘ کے بھی ہوتے ہیں۔جب ’’ہند‘‘اور ’’جہان‘‘ کے عدد برابر ہوئے تو بادشاہ کوحق ہے کہ وہ ہند کی جگہ ’’جہان‘‘ کا استعمال کریں اورشاہ جہاں کہلوائیں۔

ابوطالب کلیم اور میرزا صائب:

اس دور میں اکثر فی البدیہہ مشاعرے بھی منعقد ہوا کرتے تھے۔ جس میں کلیم کے ساتھ صائب بھی شریک ہوتا تھا۔ ''ہمیشہ بہار'' میں ایک ایسی ہی نشست کا تذکرہ اس طرح ملتا ہے۔

''روزی در خانه ظفر خان احسن پسر خواجه ابو الحسن هنگامی که فرمان فرمای صوبه کشمیر بود صحبتی منعقد شد که اکثر شاعران صاحب قدرت از قسم صائب و کلیم وغیره جمع بودند نواب سخنور بر سبیل امتحان لب رعنای که با او نظری داشت گزیده رو به عزیزان آورده که بدیه گویند کلیم بدیهه خواند:

بر لعل لب تو زخم دندان
نقشی که به مدعا نشیند

صائب نیز بدیهه رساند:

زخم دندان خوبتر کرد آن لب پرخنده را
قیمت آری بیشتر باشد عقیق کنده را

جمیع حاضران بی اختیار لب به تحسین گشودند کلیم آزرده شده این شعر بر زبان آورد:

پیش این جوهریانی که درین بازار اند
قیمت رشته فزون تربود ازگوهر ما

میرزا صائب در برابرش این گوهر قیمتی را در
سلک تقریر کشید:
شوخ چشمی بین که می خواهد کلیم بی زبان
پیش شمع طور اظهار سخندانی کند
نزدیک بود که کار به بیمزه گی کشد ظفر خان
احسن واسطه صلح شده عنان سخن را به جانب
دیگر کشید.(۴۵)

یہاں کلیم کے دو معنی لیے گئے۔ ایک تو ابو طالب کلیم جو اصل مراد تھی۔ لیکن معنی کے پردہ میں الفاظ کے جو موتی پروئے گئے ہیں وہ تلمیحی انداز میں حضرت موسیٰ کے واقعہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ جس میں کلیم کی مناسبت سے شمع طور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

میرزا صائب کی بدیہہ گوئی:

میرزا صائب کے ہم عصر اکثر ان سے مصرعہ پر مصرعہ لگوانے کی کوشش کرتے تھے۔ اسی طرح ان کے ایک شاگرد سعد بن راقم نے ایک مہمل مصرع صائب کے سامنے پیش کیا تو صائب نے اس مہمل مصرعہ پر ایک دوسرا فی البدیہہ مصرعہ لگا کر مضمون کو خاصا بہتر بنا دیا۔ سفینہ خوشگو میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"روزی سعد بن راقم، شاگرد آن جناب، مصرعه
مهمل به حضور او بر خواند. میرزا صائب بدیهةً

پیش مصرعه رسا نید که جان معنی در کالبد مردهٔ
الفاظ رسید این است."

حق را ز دل خالی از اندیشه طلب کن
از شیشه بی می، می بی شیشه طلب کن

و همین قسم الهام نامی شاعر مصرعی به
خدمتش آورد. میرزا درست کرد:

به مقدار سکون راحت بود بنگر مراتب را
دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن(۷۶)

صائب کی بدیہہ گوئی کے کتنے ہی واقعات کتابوں میں درج ہے۔ایک بار صائب ایک راستے سے گزر رہے تھے دیکھا کہ ایک طرف ایک کتّا بیٹھا ہوا ہے چوں کہ کتّا جب بیٹھتا ہے تو گردن اونچی کر کے بیٹھتا ہے۔جس سے رعونت ٹپکتی ہے۔اسے دیکھ کر صائب نے بر جستہ ایک شعر کہا اس واقعہ کو سفینۂ خوش گو و شعر العجم دونوں میں جگہ دی گئی ہے:

"وقتی بایاران چند از راهی می گذشت. سگی را
دید که بر بلندی گردن دراز کرده نشسته بود و
همان زمان برخواست و سر را زیر نهاده، ایستاد.
میرزای مرحوم معنی تازه به خاطر آورده گفت."

"سگ نشسته زاستاده سر فرازتراست

قدمی چند رفته پیش مصرع رسانید، بیت درست شد:

شود زگوشه نشینی فزون رعونت نفس
سگ نشسته ز استاده سرفرازتراست(۷۷)

شاہ جہاں اور ارجمند بانو کی بدیہہ گوئی:

جہانگیر بادشاہ کی بیوی نور جہاں کی طرح ہی اس کی بھتیجی ارجمند بانو بیگم (ممتاز محل) جو شاہ جہاں کی عزیز ترین محبوبہ نما زوجہ تھی۔ جس کی یاد میں بادشاہ نے تمام دنیا کے محلوں کا تاج، تاج محل بنوایا تھا۔ خود شاعرہ اور بذلہ سنج تھی۔ بدیہہ گوئی کی مثالیں بھی اس کی طبیعت کی موزونیت سے سامنے آئی ہیں۔ یہاں بزم تیموریہ میں تحریر ایک واقعے پر اکتفا کیا جاتا ہے:

''ایک بار شاہ جہاں جمنا کے کنارے بیٹھ کر دریا کے مناظر دیکھ رہا تھا اس کی موجوں کی طرف اشارہ کر کے ممتاز محل سے کہا:

آب از برای دیدنت می آید از فرسنگھا

ممتاز محل نے اس کا دوسرا مصرعہ فوراً موزوں کیا:

از ہیبت شاہ جہان سر می زند بر سنگھا(۷۸)

اس شعر کا لطف خاص طور پر وہ لوگ اچھی طرح اٹھا سکتے ہیں جنہوں نے سمندر کی موجوں کو ایسے مقامات پر دیکھا ہے جہاں سمندر کے کنارے پتھر کی چٹان ہوتی ہے۔ اس زمانے میں جمنا کے کنارے لال قلعہ وغیرہ کا یہ منظر عام رہا ہوگا۔ یہاں حسن تعلیل کی کیفیت کے ساتھ یہ کہنا کہ دریا کا پانی ممتاز محل کے حسن کو دیکھنے کے لیے کوسوں دور کا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے۔ شاہ جہاں کے مصرعہ پر غور کر کے اب سوچیے پانی جس حسینہ کے دیدار کے لیے اتنی صعوبتیں اٹھا کر آیا ہے وہ حسینہ ایک بادشاہ کی بیوی ہے جب اسے یہ معلوم ہوا تو وہ بادشاہ کے جاہ وجلال کے خوف سے پتھروں پر سر پٹخنے لگا۔ اس مصرعہ میں مبالغہ کے ساتھ ساتھ پہلے مصرعہ کی طرح حسن تعلیل کی خوبصورتی بھی جلوہ گر ہے کیوں کہ دریا کی موجوں کا اختتام ان پتھروں پر ہو رہا ہے اور تیزی سے آتی ہوئی یہ موجیں

ایسا لگتا ہے کہ جیسے پتھروں پر سر پٹخ رہی ہیں۔

جہاں آرا بیگم:

ارجمند بانو ممتاز محل اور شاہ جہاں بادشاہ کی بیٹی جہاں آرا بھی شاعرانہ مزاج سے بہرہ ور تھی وہ ایک اچھی شاعرہ ہونے کے ساتھ سلطنت کے کاموں کی واقف کار اور صوفی منش عورت تھی۔ قادری سلسلے سے بیعت ہونے کی بنا پر اس کے کلام میں عرفانی پہلو بہت نمایاں ہیں۔

جہاں آرا بیگم اور میر صیدی تہرانی:

میر صیدی تہرانی شاہ جہاں آباد میں جہاں آرا بیگم کے مہتاب باغ کے دروازے کے قریب سکونت پذیر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر جہاں آرا بیگم کو آتے جاتے دیکھتے تھے،۔ جہاں آرا بیگم ایک دفعہ باغ کی سیر کو ہاتھی پر برقع ڈالے نکلی، میر صیدی تہرانی چھپ کر تماشا دیکھنے لگا، جب ہاتھی اس کے پاس سے گزرا تو اس نے بے ساختہ مطلع پڑھا۔ جہاں آرا نے حکم دیا کہ شاعر کو کشاں کشاں سامنے لائیں، وہ آیا تو اس سے بار بار مطلع پڑھوا کر سنا اور پانچ ہزار روپے دلوائے لیکن ساتھ ہی حکم دیا کہ اس کو شہر سے نکال دیا جائے، کیوں کہ جہاں آرا کو شعر تو پسند آیا لیکن گستاخی پسند نہ آئی۔

اسی مناسبت سے ایک دوسرا واقعہ سفینۂ خوشگو سے نقل کیا جاتا ہے:

"در شاهجان آباد، بر سر دروازه باغ جهان آرا بیگم، واقع بـه مهتاب بازار سکونت اختیار کرد. روزی بیگم صاحب، به سواری فیل به

باغ آمد. این مطلع بلند را که در سخنوران پایتخت زلزله انداخته بود، بدیده به بانگ بلند برخواند. به صله تحسین و انعام پانصد روپیه سربلند گردید. مطلع این است:

برقع به رخ افکنده برد ناز به باغش
تا نکهت گل ریخته آید به دماغش

صاحب کلمات الشعرا نوشته که وقتی با صاحب سخنان و مصاحبان، بر لب جویی نشسته بود. این مطلع چون آفتاب از مطلع طبعش سر زد:

ازین خود کام یاران رنگ الفت می برد مارا
که بهر صید ماهی خشک می خواهند دریا را

قضا را ماهی از آب برجست و به دامنش افتاد. صلۂ شعر، من جانب الله برداشت و یاران را ضیافت نمود. به همه حال شاعر خوش خیال صاحب کمال است اگر چه کم گفته اما بسیار معانی نجیب یافته". (۷۹)

شاہزادہ مراد اور سعید قریشی:

شاہ جہاں بادشاہ کے بیٹے مراد (جس کی شراب نوشی اور دربار کی رنگینیوں سے ہر کوئی واقف ہے) کے دربار کا مشہور شاعر سعید قریشی تھا۔ جو نہایت بذلہ سنج اور بدیہہ گوئی

میں اپنا جواب آپ تھا۔ یہاں بدیہہ گوئی سے متعلق اس کے چند واقعات ''بزم تیموریہ'' جلد سوم سے اخذ کیے جارہے ہیں:

''اوائل ملازمت میں ایک روز سعید قریشی نے مراد کے دربار میں جانا چاہا تو داروغہ غسل خانہ نے جو ''یکی از چیلها بود'' اندر جانے کی اجازت نہ دی، سعید قریشی نے فوراً یہ رباعی لکھ کر مراد کے پاس بھیجی:

ای شاہ جنابت چو جناب اللہ است
ہر حکم تو چون حکم کتاب اللہ است
این چیلہ دیو فعل منّاع درت
ابلیس صفت مانع باب اللہ است

مراد رباعی پڑھ کر بہت محظوظ ہوا اور سعید قریشی کو زنان خانہ کے علاوہ ہر جگہ آنے جانے کی اجازت دیدی۔ (۸۰)

ایک بار عید الاضحیٰ کے موقع پر مراد اپنے ہاتھوں سے بکرا ذبح کر رہا تھا، بکرے کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی، مراد نے بکرے کی آنکھیں دیکھیں، اس کی نظر سعید قریشی کی طرف اٹھی تھی، سعید قریشی نے فی البدیہہ شعر پڑھا:

عید قربان است و می خواہم کہ قربانت شوم
ہم چو چشم گوسفند کشتہ حیرانت شوم (۸۱)

ایک مرتبہ عید الفطر کے موقع پر مراد کی سواری عید گاہ جارہی تھی، سعید قریشی مجرا کے لیے حاضر ہوا، مراد نے اس سے دریافت کیا کہ عید الفطر کی تہنیت میں اس نے

کچھ کہا ہے یا نہیں، اتفاق سے سعید قریشی نے کچھ کہا نہیں تھا اور پوچھنے کے بعد مراد نماز میں مشغول ہو گیا، سعید قریشی کو موقع مل گیا، اس درمیان اس نے ایک غزل تیار کر لی، مراد نماز پڑھ چکا تو سعید نے غزل پیش کی، مراد شراب کا بڑا دل دادہ تھا، اس غزل میں اس کی خاص رعایت رکھی گئی ہے:

روز عید ست لب خشک می آلود کنید
چاره گاران خود ای تشنه لبان زود کنید

دیر گاهی ست که از دیر مغان دور تریم
زود باشید به کف جام ز راندود کنید

شربت حب نبات لب جان بخش ایاز
نوش داروی دل خسته محمود کنید

حرف بی صرفه واعظ نتوان گرد بگوش
گوش بر زمزمه چنگ و نی وعود کنید

هست بهبود شما بندگی شاه مراد
بهتر آنست که اندیشه بهبود کنید

شیوه صدق چو سرمایه هر سود بود
هست امید کزین شیوهٔ بی سود کنید

پدرش یافت ره از طالع مسعود سعید
سعی دریافتن طالع مسعود کنید

شہزادہ مراد نہ صرف غزل سے محظوظ ہوا بلکہ سعید قریشی کی اس بدیہہ گوئی پر حیرت کا اظہار کیا''۔ (۸۲)

میرزا رضی دانش:

اسی زمانے میں میرزا رضی دانش ہندوستان آئے۔ بدیہہ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ دارا شکوہ بھی اس فن میں کافی مہارت رکھتا تھا۔ ایک طرحی مشاعرے کے ذیل میں سفینہ خوشگو میں درج ہے:

"میرزا رضی دانش از سادات رضوی مشهد مقدس است. به رفاقت مرزا ابوتراب به هندوستان آمد. شاه بلند اقبال این بیتش را طرح کرده، سه هزار روپیه صله عنایت فرمود:

تاک را سیراب کن ای ابر نیسان در بهار
قطره تا می می تواند شد، چرا گوهر شود؟

همه حضار مجلس طبع آزمائی کردند. بادشاه زاده دارا شکوه به او رسید شعر شاهزاده این است:

سلطنت سهل است، خود را آشنای فقر کن
قطره تا دریا تواند شد، چرا گوهر شود (۸۳)

میرزا ابوالبرکات منیر لاہوری:

اسی دور میں میرزا ابوالبرکات منیر لاہوری ایک بڑا شاعر ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ اورنگ زیب نے سلطنت شاہ جہانی پر قبضہ کرنے کے بعد اپنے نام کا سکہ ڈھلوانے کے

لیے شعراء وعلماء سے سکے پر کندہ کرنے کے لیے عبارت کا تقاضہ کیا کئی اشعار اور عبارتیں سامنے آئیں لیکن اسی منیر لاہوری کے مندرجہ ذیل شعر کو سکہ عالمگیری پر کندہ ہونے کا شرف حاصل ہوا:

سکہ زد در جہان چو بدر منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر (۸۴)

داراشکوہ اور منیر لاہوری:

ایک بار داراشکوہ نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں سیف خاں کو ایک خلعت عطا کی اتفاق سے خان خاصے موٹے تازے تھے اور خلعت کچھ تنگ تھی اس بنا پر وہ اسے پہن نہ سکے۔ منیر وہاں موجود تھا۔ اس نے فی البدیہہ مندرجہ ذیل شعر چسپاں کر دیا۔ جس سے طنز و مزاح کا حسن بہت عیاں ہے:

ببالید از بس کہ بر خویشتن
ز شادی نگنجید در پیرھن (۸۵)

محی الدین محمد اورنگ زیب:

شاہجہاں بادشاہ کے بعد اورنگ زیب جب تخت نشین ہوا تو اس نے مغلوں کی بہت سی روایتوں کو کالعدم قرار دیا۔ یہاں تک ملک الشعراء کے عہدے کی باقاعدگی پر بھی حرف آیا اور قلعے سے متعلق جو شاعروں کی خوش اسلوبیاں اور جولانیاں تھیں وہ ماند پڑ گئیں۔

سلطان شادمان اور بادشاہ اورنگ زیب:

اس کے باوجود جس طرح ہواؤں اور ندیوں کے پانی کو سرحدوں میں مقید نہیں کیا جاسکتا اسی طرح پرواز تخیل کو مہمیز کرنا بھی ممکن نہیں ہے شعروشاعری کا سلسلہ چلتا رہا۔ خود اورنگ زیب کے زمانے میں ہی کیا اس کے دربار میں ہی نعمت خاں عالی، عاقل خاں رازی جیسے بلند پایہ شاعر موجود تھے۔ کہتے ہیں وہ اپنی مدح سرائی سننے کا قائل نہیں تھا۔لیکن ایک بار سلطان شادمان نے اس کی مدح میں اس کے روبرو مندرجہ ذیل قصیدہ پڑھا جسے اس نے بہت غور سے سنا اور کئی اشعار کوئی بار دہروایا بھی۔جیسا کہ مرآۃ الخیال میں درج ہے:

"سلطان شادمان قصیده مشتمل بر مدح گفته بسمع مبارک رسانید و بعض ابیاتش پسند خاطر فیاض افتاد و به تکرار استماع فرمودند". (۸۶)

مکمل قصیدہ بھی ملاحظہ کیجیے:

آن کیست کو ز حلقهٔ لعلت نشان دهد
در خواب اگر دهد بطریق کمان دهد

آب حیات خضر که عمریست جاودان
تا کی ز حضرت لب لعل تو جان دهد

فکر سخن طراز که خضریست فی المثل
خود در عدم رود چون نشان زان میان دهد

ابـــر قـلـم کـــه آب سیـــه مـی چـکـد ازو
رنگ سـخـن ز وصف لـب گـل رخـان دهد

قـد نـو در خـرام بـگـلـگشـت بـوستـان
صـد پیـچ و خـم ز شـرم بـه سرو چمـان دهد

آنـجـا کـه اوسـت نـالـه عـاشق کجـا رسد
گـر بـال جبـرئیـل بـه مـرغ فغـان دهـد

از چشـم جـانستـانـش چـو خـواهم حیات نو
مـژگـان جـواب مـن بـه زبـان سـنـان دهد

گـر دل ستـانـد از نـگـه عشـوه آفـریـن
صـد دل عـوض ز طـره عـنبـر فشـان دهـد

چـون شیشـه شـراب کـه بـا محتسب دهند
کـس دل چـرا بـه دسـت تـو نا مهربان دهد

نـازم بـه چهـرهٔ کـه بـه هنگام می ز عکـس
رنـگیـنـیٔ بهـار بـه فـصـل خـزان دهـد

هر چیز را به خاصیتی آفریده اند
کی سرمه در گلو اثر زعفران دهد

من خود به درد یار خوشم ورنه روزگار
کی این قدر الم به دل شادمان دهد

چشمش بابروان و مژه گشت عالمی
کس ترک مست راز چه تیر و کمان دهد

زلفش مزد ریست مکن اعتبار او
از عشوه گر دلی به تو شب درمیان دهد

مضمون دلنشین که رسد از جهان غیب
یاد از طراوت سخن باستان دهد

مرد آن بود که گر همه عالم بدو دهند
دل کم دهد به شادی و غم تا که جان دهد

ما جان به نقد مهر و وفا داده ایم و بس
دیوانه نیستیم که جانی بنان دهد

شاید مراد من کہ نخواهم ز آسمان
اورنگ زیب عادل گیتی ستان دهد

شاهی کہ از برای سر دشمنان دین
بهر نثار گوهر تیغ یمان دهد

بهرام صولتی کہ ز بیمش پئی گریز
گردون عنان خود بره کهکشان دهد

تا ارض بر سکون و سما در تحرک است
تا چتر آفتاب ز مشرق نشان دهد

زیبنده باد بر سر اورنگ سلطنت
تا ابر و مهر راتب دریا و کان دهد(۸۷)

نعمت علی خان عالی اور اورنگ زیب کی مدح:

خود نعمت علی خان عالی نے اورنگ زیب کی مدح میں قصائد تحریر کئے ہیں۔ جن میں سے ایک مشہور قصیدہ مندرجہ ذیل مطلع سے شروع ہوتا ہے جس میں اس نے بادشاہ کے بہت سے جداگانہ اوصاف بیان کیے ہیں: مطلع

شاھا! نظر بہ روی تو کردن عبادت است
مژگان بھم زدن چو نماز جماعت است(۸۸)

ان واقعات سے اورنگ زیب کی دلی کیفیت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور صرف دولت کو دکن کی جنگ پر لٹانے کی بنا پر مغل دربار کے تمام ادبی وثقافتی کام بند کر دیے گئے۔ اس دور کے دیگر شعراء میں رفیع خاں باذل، حکیم محمد کاظم، غلام علی تحسین، عبدالباقی صہبائی، مرزا محمد علی ماہر، محمد افضل سرخوش، منعم خاں، احمد یار خاں یکتا، وامق کھتری، بھیم سین وغیرہ کے علاوہ دور شاہجہاں کے نہایت معروف شاعر فانی کشمیری، غنی کشمیری، اسلم سالم اور ان سب سے بڑھ کر عظیم رباعی گو سرمد شہید کے نام بھی لیے جاسکتے ہیں۔ خود اس کی بہن جہان آرا اور بیٹی زیب النساء بھی شعر وشاعری سے خاصہ شغل رکھتی تھیں اور بہترین شاعرات میں سے تھیں۔

عاقل خان رازی:

دراصل اورنگ زیب کی شخصیت متضاد اوصاف کی حامل رہی ہے۔ کچھ لوگ تو اس کے نام کے ساتھ (رح) کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنے والد کا دشمن، وقت کے بادشاہ سے بغاوت کرنے والا، اپنے والد کو قید کرنے والا، بھائیوں اور بھتیجوں کا قاتل تھا۔ خود سید صباح الدین عبدالرحمٰن مصنف بزم تیموریہ اس کے مرید نظر آتے ہیں اور اس کے تمام گناہوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے ایک جنتی کردار کا غازی ثابت کرتے ہیں۔ لیکن تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے کہ اصلیت اگلوا ہی لیتی ہے۔ لہذا موصوف کو بھی عاقل خان رازی کے حالات میں اورنگ زیب

کی رقاصہ سے رغبت اور اس کے گانوں سے محظوظ ہونے کے احوال لکھنا پڑتے ہیں جس کی شریعت میں بالکل گنجائش نہیں ہے۔ یہاں یہ واقعہ بدیہہ گوئی کی بنا پر تحریر کیا جا رہا ہے:

''عاقل خاں رازی، میر عسکری نام، اس کا خاندان خواف کے سادات میں سے تھا، حضرت برہان الدین رازی برہان پوری کا معتقد تھا، اس لیے رازی تخلص کرتا تھا، شہزادہ اورنگ زیب کے ساتھ بخشی گرہ دوم کے منصب پر مامور تھا، اس سے بے تکلفی سے ملتا رہا اورنگ زیب کی شہزادگی کے زمانہ میں اس کی ایک کنیز (یکی از پرستاران خاص) کا انتقال ہوگیا، اس سے اورنگ زیب روز تازہ بہ تازہ نو بہ نو گانے سن کر محظوظ ہوا کرتا تھا، اس کے انتقال پر ملال پر وہ بہت ہی غمگین ہوا، اپنا غم غلط کرنے کے لیے دوسرے روز شکار میں چلا گیا، میر عسکری بھی ساتھ تھا، تنہائی میں میر عسکری نے اس سے پوچھا، اندوہ وملال کی شدت میں شکار کھیلنے کے کیا معنی؟ اورنگ زیب نے جواب میں یہ شعر پڑھا:

نالھائی خانگی دل را تسلی بخش نیست
در بیابان می توان فریاد خاطر خواہ کرد

میر عسکری نے یہ شعر سن کر فوراً عرض کیا:

عشق چہ آسان نمود آہ چہ دشوار بود
ھجر چہ دشوار بود یار چہ آسان بود

اورنگ زیب نے اس شعر کو سن کر اس کو دوبارہ پڑھنے کا حکم دیا اور

پوچھا، یہ شعر کس کا ہے؟ میر عسکری نے کہا ایسے شخص کا ہے جو نہیں
چاہتا کہ اپنے آقا کے حضور میں خود کو شاعر بتائے، یہ شعر دراصل اسی
کا تھا اورنگ زیب پر اس شعر سے رقت طاری ہوگئی اور اس کو بار بار
پڑھتا رہا"۔ (۸۹)

سرمد شہید:

دور اورنگ زیب کے آغاز میں سرمد شہید جیسا رباعیات کا بزرگترین شاعر بھی موجود تھا۔ اس سے داراشکوہ کے قریبی تعلقات تھے اسی پاداش میں اسے شہید کیا گیا لیکن علت کوئی دوسری بتادی گئی۔ اس قتل کے سلسلے میں روایتیں ہیں بدیہہ گوئی میں بھی اسے مہارت حاصل تھی بقول خوشگو:

"چون در همه جا مشهور است که محبت، خضر راه است، سرمد بی واسطه راهنما به در دروازه خانه میر بخشی آمده بنشست و با هیچ کس پروای حرف زدن نداشت. بعد از چند روز میرزای مذکور بر سر دروازۀ خانه نشسته این بیت را تکرار می کرد:

کلید مخزن افلاک گر در دست من افتد
کواکب را بـه راه اهل حاجت چون درم باشم

سرمد شنید وبرخاست. بدیهه این رباعی بر خواند:

ای باد صبا بگو به میر بخشی
ای کرده، فلک به زیر رایت رخشی
گفتی که کواکب چو درم می پاشم
خورشید مرا نیز به من می بخشی (۹۰)

اس رباعی سے نتیجہ یہ نکلا "سرمد را از دیدارش منع نکنند"۔ سرمد کی بدیہہ گوئی کے اکثر واقعات سننے کو ملتے ہیں خاص طور سے اس کی شہادت کے متعلق بھی مندرجہ ذیل رباعی ابھی تک ذہنوں میں گونج رہی ہے:

آن کس که ترا کار جهان بانی داد
مارا همه اسباب پریشانی داد
پوشید لباس هر کرا عیبی دید
بی عیبان را لباس عریانی داد

اورنگ زیب کے بعد:

اورنگ زیب نے ہندوستان کی دکنی سلطنتوں کو فتح کر کے ہندوستان کے سب سے بڑے حصے پر حکومت کی۔ بظاہر یہ فتح تھی لیکن یہی فتح مغل سلطنت کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ غالباً یہ راز اورنگ زیب کی بیٹی اچھی طرح سمجھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ "واقعات دارالحکومت دہلی" میں اسی ذیل میں ایک عنوان قائم کیا گیا:

اورنگ زیب کا سوال اوراس کی بیٹی زیب النسا کا برجستہ جواب:

''اورنگ زیب جب قطب شاہی اور عادل شاہی دونوں گھرانوں کا کھوج کھو چکا تھا تو بہت ہی مسرور ہوا کہ پشتہا پشت سے ملک دکن پر دانت تھا اور خود بھی بار ہا اپنی سعی میں ناکام رہا تھا۔ اب خدا نے یہ دن دکھایا جس کی خوشی میں بڑا بھاری جشن کیا۔ امرا و ارکان سلطنت کو سرفرازیاں ہوئیں۔ داد و دہش کا دروازہ کھل گیا۔ سب امرا نے مبارکباد کی نذریں دیں لیکن زیب النسا بیگم نے جو بادشاہ کی صاحب زادی تھیں نذر نہیں دی۔ بادشاہ نے پچھوایا کہ آخر کار کیا سبب جو زیب النسا نے نذر نہ دی۔ تھی تو وہ عورت ذات مگر مردانہ وار جواب دیا کہ کون سی خوشی کی بات تھی جو میں نذر دیتی۔ آپ نے ایسا کونسا بڑا کام کیا ہے جو سزاوار شہنشاہی ہو۔ حضرت پہلے شہنشاہ تھے کہ آپ کے تابع فرمان کئی بادشاہ مثل ابوالحسن تانا شاہ اور سکندر عادل شاہ کے تھے اور آپ کے مطیع و منقاد اور باج گزار تھے لقب شہنشاہی آپ پر سجتا تھا اور اب دیکھیے کہ آپ نے سب کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر کیا اور اب صرف حضرت کی ذات مقدس تن تنہا رہ گئی۔ پس مرتبت شہنشاہی سے گھٹ کر بادشاہ رہ گئے۔ ملک الموت کے رتبے سے اتر کر ملک رہ گئے۔ پس یہ کون

سی بات مبارکباد دینے کی ہے۔ جہاں پناہ خود غور فرمائیں۔
بادشاہ یہ معقول جواب سن کر بہت متاثر ہوا اور کہا کہ فی
الواقع زیب النسا جو کچھ کہتی ہے، درست کہتی ہے:

چو رای زن از رای مرد اکمل است

تو ان گفت زن را کہ او اکمل است(۹۱)

ممکن ہے زیب النسا پوری بات نہ کہہ سکی ہو اور ادھوری بات کہہ کر رک گئی۔ لیکن اس کی فکر کے اشارے خاتمے کی طرف ضرور رہے سچ تو یہ ہے کہ اس حکوت کو قابو میں نہ رکھا جاسکا۔ اسی زمانے میں مراٹھوں کے سردار شیوا جی نے اورنگ زیب سے کئی قلعے چھین کر مراٹھا حکومت کی بنیاد رکھی تو دہلی سے ۲۵ سال دور رہنے کی بنا پر صوبہ پنجاب بھی مغل حکومت کے ہاتھوں سے کھسکنے لگا۔ بنگال میں انگریزوں کی سازشیں رنگ لائیں۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات ہوتی ہے۔ جس کی نصف صدی گزرنے پر ہی ۱۷۵۷ء سے انگریزوں کی حکومت کا عروج شروع ہو جاتا ہے۔ اورنگ زیب کی، کی ہوئی غلطیوں کا خمیازہ ہندوستانیوں، مسلمانوں یہاں تک کہ فارسی زبان کو بھی بھگتنا پڑا۔ آج جو ہماری حالت ہے اس کی ذمہ داری اسی بادشاہ کے سر ہے۔

حالانکہ اورنگ زیب کے بعد اس کے بیٹوں کے درمیان ہونے والی جانشینی کی خونی جنگ میں کامیاب ہونے والا شہزادہ معظم شاہ، شاہ عالم بہادر شاہ بادشاہ بنا جو خود بھی شاعر تھا۔ ۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۲ء تک حکومت کی اس کے بعد جہاندار شاہ بہت تھوڑی مدت حکومت کر کے قتل ہوا پھر اس کا بھتیجا فرخ سیر تخت نشین ہوا۔ صرف چند سال حکومت کر سکا۔ اس کے بعد رفیع الدرجات تین ماہ، اس کے بعد رفیع الدولہ شاہ جہاں ثانی چار ماہ کے لیے تخت پر بیٹھا۔ آخر کار سادات بارہ کے بادشاہ گری کے کھیل میں روشن اختر محمد شاہ

(اکتوبر ۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔ اسی کے دور میں دکن، اودھ، روہیلکھنڈ کے علاوہ مراٹھوں اور سکھوں کی حکومتیں بھی قائم ہوئیں۔ اسی کے زمانے میں نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے جاں سوز حملے بھی ہوئے۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ، اس کے بعد عزیز الدین عالم گیر ثانی نام کا بادشاہ رہا۔ اسی کے دور میں ۱۷۵۷ء کی پلاسی کی جنگ ہوئی اور انگریزوں کی حکومت کا آغاز ہوا اور ۱۷۵۹ء میں شاہ عالم ثانی جن کے لیے مشہور تھا کہ شاہ عالم قلعہ تا پالم گویا ان کی سلطنت اتنی ہی رہ گئی تھی۔ ۱۸۰۶ء میں انھوں نے سفر آخرت اختیار کیا اور ان کے فرزند اکبر شاہ ثانی نام نہاد بادشاہ بنے۔ انہیں کے دور میں انگریزوں نے فارسی زبان کا سرکاری درجہ ختم کر دیا۔ ۱۸۳۷ء میں ان کی وفات کے بعد سراج الدین بہادر شاہ ظفر خاتم السلاطین مغول تخت پر بیٹھے۔ جو ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں قید اور ۱۸۶۲ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء میں حکومت کرنے والے بادشاہ بھی اکثر شاعر و ادیب ہوئے ہیں۔ اسی طرح نئے مراکز دکن، اودھ، روہیلکھنڈ کے علاوہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے نوابین نے بھی فارسی ادب کی سرپرستی کی۔ اس طرح ۱۸/ویں اور ۱۹/ویں صدی میں فارسی کے شعرا و ادبا نے خود ذاتی طور پر بھی اس زبان کی خدمت کی اور اس دور کے سرمایے کو گذشتہ دور سے کسی طور کم نہیں ہونے دیا۔ یہاں تک کہ بدیہہ گوئی کی روایت بھی قائم و دائم رہی۔

خواجہ محمد عاصم:

فرخ سیر کے زمانے میں خواجہ محمد عاصم، خان دوران بہادر کے خطاب سے نوازے گئے جو اس دور کے فی البدیہہ غزل کہنے والوں میں اپنی مثال آپ تھے۔ فرخ

سیر بادشاہ سے خاصی قربت تھی۔ایک دن بادشاہ آئینہ دیکھ کر بن سنور رہا تھا۔نواب خان دوران وہاں موجود تھے۔ برجستہ ایک غزل موزوں کی، جیسا کہ ''سفینہ ہندی'' میں درج ہے:

''روزی محمد فرخ سیر بادشاہ آیینہ می دید،
نواب کہ از حضار بود بدیھة غزل گفتہ،
معروض داشت، مطلعش این است:
سحر خورشید لرزان بر سر کوی تو می آید
دل آیینہ را نازم کہ بر روی تو می آید(۹۲)

موقع کے لحاظ سے اس شعر کی کیفیت کا اندازہ نہایت وجد آمیز ہے۔

موتمن الدولہ خان بہادر محمد اسحٰق:

محمد شاہ کے زمانے میں موتمن الدولہ خان بہادر محمد اسحٰق اس کے وزرا میں سے ایک تھے۔خود شاعر تھے اور شاعروں کے قدرداں بھی، نہایت ہنس مکھ، لطیفہ گو اور فی البدیہہ شعر کہنے میں ماہر فن۔نادر شاہ کے حملے میں ایک قیامت کا سماں تھا۔عوام کا قتل عام نادر شاہ کے مقصد میں شامل نہیں تھا۔لیکن حالات نے یہ کام بھی انجام دلوایا۔نادر شاہ کے ایک وزیر مانی عبدالباقی نے محمد اسحٰق سے شکایت کی کہ دہلی کے لوگ ایک اور قتل عام چاہتے ہیں۔توانہوں نے برجستہ ایک شعر پڑھا جس سے مراد ہے کہ اب کوئی باقی نہیں بچا ہے کہ جسے تیغ ناز سے قتل کیا جائے اب تو یہی ہوسکتا ہے کہ تو ان مردہ لوگوں کو دوبارہ زندہ کر کے موت کے گھاٹ اتار دے۔''مجمع النفائس'' میں یہ واقعہ اس طرح

درج ہے:

"بشـگـفتـه رویی و لطیفه گویی یکتای روزگار و منتخب لیل و نهار بود. چنانکه ایامی که نادر شاه بآن عظمت و جلال که زهرهٔ زمانه غدار در پیش او آب میشد هنگامی که ایشان را در خدمت بادشاه مغفور مرحوم فردوس آرامگاه محمد شاه دید، از بسکه جبین اقبال آیینه اش می تافت. از بادشاه مذکور پرسید که این جوان خوش سیما کیست. و در هنگامی که قشون نادر شاهی از قتل عام دار الخلافه شاه جهان آباد دهلی فارغ گشته، مشغول تحصیل مال امانی عبد الباقی خان که یکی از وزرای نادر شاه بود، بر سبیل شکایات بایشان گفت که مردم دهلی باز یک قتل عام می خواهند. نواب مرحوم مسطور فی الفور در جواب او این بیت خواند:

کسی نماند که دیگر به تیغ ناز کشی
مگر تو زنده کنی خلق را و باز کشی (۹۳)

میرزا محمد:

اسی ہنگامے میں میرزا محمد منشی، شاعر و بذلہ سنج تھے۔ جملے پر جملہ چپکانے میں اپنا جواب آپ تھے۔ بیباک اور حاضر جواب بھی تھے۔ جس وقت نادر شاہ قتل عام پر آمادہ تھا کسی کی ہمت نہ تھی کہ اس سے بات کر سکے۔ ایسے ماحول میں نادر شاہ سے میرزا محمد کی بیباکانہ گفتگو کا انداز ''سفینۂ ہندی'' کے حوالے سے پیش کی جا رہی ہے:

''بمقتضای شوخی طبع باوجود آن که پیش نادرشاه هیچ کس را یارای سخن نبود، روزی گستاخانه عرض نمود که بنده را در خدایی و پیغمبری و بادشاهی حضرت ولی نعمت شبه است، امید که رفع فرمایند، زیرا که اگر خدا باشند خدا را خلق ضرور است، تا پرستش او نمایند و پیغمبر را امت تا تبعت سنت او بجا آرند و بادشاه را رعیت که موجب نظام سلطنت است خداوند نعمت رسم عالم کشی بنا نهاده، هر روزخرمن زندگانی جمعی را به برق شمشیر می سوزند، یقین است که بکمتر زمان نشان آدمی زاد بر روی زمین نخواهد ماند، پس ازین هر سه کدام کس خواهند بود، نادر شاه جواب داد که ما ازین هر سه هیچ یک نیستیم، بلکه قهر خدا ایم که بشامت اعمال سیه مردم برای

عقوبت ایشان نازل شده ایم". (۹۴)

شرف الدین پیام:

اکبرآباد کے شعرا میں سے ایک شاعر شرف الدین پیام بھی تھے بدیہہ گوئی میں دوسروں سے آ گے۔ بقول سراج الدین علی خان آرزو:

"از مردم اکبر آباد بود. ذهنی درست و طبعی سلیم داشت. زبان شعر را بسیار ورزیده وخیلی خوب می گفت، تلاش معنیهای تازه می نمود. دیوانی دارد مشتمل بر هفت هزار بیت. اوایل به نسبت هم وطنی بلکه هم محلگی در اکبرآباد با فقیر خیلی محشور بود، باهم می نشستیم و شعر می گفتیم. درین ضمن اگر امدادی هم ازین عاجز بظهور میرسید دور نبود. و یک دو رساله دیگر نیز پیش فقیر خوانده (۹۵)

مخلص کے گھر میں ایک دن بیدلؔ کے شاگرد پیام، فقیر وعطا وغیرہ جمع تھے آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے کہ عطا نے پیام پر ایک پھبتی کسی پیام نے فی البدیہہ جواب دیا:

"روزی به خانه رای رایان مخلص، پیام و فقیر و محمد عطائی "عطا" تخلص از شاگردان میرزای مرحوم عبد القادر بیدل، وارد بودیم.

عـطـا و پیام باهم شوخی می نمودند. عطا گفت: بـوسه به پیام خالی از تازگی نیست! با آن که این حرف چندان نیست، پیام تر آمده این بیت بدیهه گفت:

دوستــان بــکــر نیســت فـکـر عـطـا
هست از نا درستیش پیدا(۹۶)

غلام علی آزاد بلگرامی:

آزاد بلگرامی اس دور کے ایک اہم ادیب، تذکرہ نگار، شاعر اور دانشور رہے ہیں۔ یوں تو انہوں نے کبھی کسی کی مدح سرائی نہیں کی۔لیکن ۲۲ رشعبان ۱۱۵۰ھ میں جب ان کی ملاقات نواب آصف جاہ سے ہوئی تو انہوں نے فوراً اپنے حج جانے کی آرزو اور ان کی مدح سرائی صرف ایک رباعی میں موزوں کی۔ یہ واقعہ ''سروآزاد'' میں موجود ہے:

ای حـامـی دیـن مـحیط جود و احسـان
حـق دار تــرا خـطــاب آصف شـایـان
او تـخــت بـــه درگـــاه سلیمـان آورد
تــو آل نبـیؐ را بـــه کـعبـــه رسـان(۹۷)

راجہ رام نرائن:

۱۷۵۷ء کے بعد انگریزوں کی حکومت و طاقت میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ حالانکہ میر جعفر کا بیٹا میر قاسم ابھی حکومت کے نشے میں چور تھا۔ اسی دور میں راجہ رام نرائن عظیم آباد میں امارت کے درجے پر فائز تھے۔ شاعر و شاعر نواز بھی تھے۔ قاسم علی خاں کے لشکر نے ان پر حملہ کیا اور قتل کرنے سے قبل ان سے دریافت کیا کہ کوئی آرزو رکھتے ہو۔ انہوں نے پانی پینے کی خواہش ظاہر کی۔ ''سفینہ ہندی'' میں اس واقعہ کو اس طرح ضبط کیا گیا ہے:

''بالجمله قاتلان هنگام گردن زدنش، ازو سوال کردند که هیچ آرزو می داری، گفت دمی آب، آنها کاسه پر از آب به نزدش آوردند راجه عالی مقام دست رو به آب زده کاسه را بر زمین انداخت و این بیت بدیهه بر زبان راند:

محروم رفته از تو لب تشنهٔ حسینؑ
ای آب خاک شو که ترا آبرو نماند(۹۸)

سانحۂ کربلا سے واقف حضرات خوب جانتے ہیں کہ اس شعر کے ذریعے راجہ نرائن نے اپنے قاتلوں کو یزیدی بتاتے ہوئے خود امام حسینؑ کی طرح پیاسے اس دنیا سے رخصت ہونا گوارہ کیا ہے اور یہ کہنا کہ ''**ای آب خاک شو که ترا آبرو نماند**'' مرثیے کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔

سراج الدین علی خان آرزو:

اس دور کا سب سے اہم دانشور ہمہ جہت کمال کا حامل شاعر، ادیب، تذکرہ نگار، ناقد، لغت نویس وغیرہ تمام ادبی محرکات کا حامل ہندوستانی فارسی کا دلدادہ سراج الدین علی خان آرزو کو کہا جا سکتا ہے۔ اس دور کے اکثر صاحب کمال ان سے فیض حاصل کرتے تھے۔ ان کی بدیہہ گوئی کی ایک مثال ''خزانہ عامرہ'' سے رقم کی جارہی ہے:

"حاکم در مردم دیده می نویسد فقیر را به آرزو
ربط و اخلاص زیاده از حد بود روزی غزلی در
تتبع غزلش گفتم که مقطعش این است:

گر چنین از فیض خان آرزو گیرد نمک
طرف شورای این غزل حاکم بلاهور افگند

خان مرحوم این بیت بدیهه گفته فرستاد:

نیست شعر آرزو را رتبه ای
گر تو با این هم پسندی حاکمی (۹۹)

اس واقعے سے اس دور کے شعرا میں ایک دوسرے کی نسبت اخلاص وانکساری کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

احمد یار خاں یکتاؔ:

بدیہہ گوئی کی روایت نے اکثر شاعروں کی جانیں بچائی ہیں تو تخلص کے فسادات کو بھی ختم کیا ہے۔ یوں تو ایک تخلص کے کئی شاعر ہو سکتے ہیں اور ہوئے بھی ہیں۔

لیکن کوئی بھی مشہور شاعر اپنی زندگی میں یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کے نام کا کوئی دوسرا شاعر بھی ہو۔ اس ذیل میں ایک حکایت سلطان محمد اور خان زمان کی بیان ہوچکی ہے کہ کس طرح سلطان محمد سلطان کی جان پر بن آئی تھی۔ یہاں احمد یار خاں یکتا کے تخلص یکتا پر بن آئی تھی۔ یکتا اورنگ زیب کے زمانہ آخر سے محمد شاہ بادشاہ کے دور تک منصب امارت پر فائز رہا۔ اس کے دور میں ایک کشمیری شاعر محمد اشرف یکتا بھی موجود تھے۔ انہوں نے احمد یار سے کہا کہ یہ تخلص میرے حصے میں چھوڑ دو۔ اس نے جواب دیا دونوں رہ سکتے ہیں۔ اس بات پر اشرف راضی نہ ہوا۔ لہذا طے ہوا کہ دونوں طرحی غزل موزوں کریں گے جو پہلے لکھ لے گا تخلص اسی کا ہوگا۔ احمد یار یکتا نے نہایت تیزی سے فی البدیہہ غزل کہی جسے سن کر محمد اشرف حیران رہ گئے۔ وہاں جمع استاد سخن میں آفرین لاہوری بھی موجود تھا۔ اس نے فی البدیہہ احمد یار یکتا کی گواہی میں ایک شعر نہایت دلکش موزوں کیا۔ ''سفینہ ہندی'' میں اس واقعے کو مفصل بیان کیا گیا ہے:

''وقتیکه محمد اشرف یکتا که ذکرش می آید
باو سوال کرد که این تخلص را بمن بگذارند،
او جواب داد یکتا بودم، دو تا شدم، او برین
حرف راضی نشد تا با هم قرار یافت که هر دو
صاحبان غزل طرح نمایند هر که پیش برد
تخلص ازو باشد، خان مسطور روزی صحبتی
طرح داده اغرۂ سخن فهم را دعوت کرد، و
یکتای مدعی را دران محفل طلبیده این غزل
طرح خواند:

تـا خـطـش طـرح جهـانگیـری کـاؤسـی ریخـت
لشـکـر زنگ چـو رومـی بسـر روسـی ریـخـت

بـا میـدیـکـه شـود جـلـوه گـران سـرو روان
خـاک شـد جبهـه و در راه قـدم بـوسـی ریـخـت

سـرمـه آلـود نـگـاه کـه بیـادم آمـد
کـه سـرشک شـفـقـی از مـژه ام طوسـی ریخـت

بـر در میـکـده از نـالـه زارم نـاقـوس
همـه تـن اشک شـد و در بـر نـاقـوسـی ریخـت

شـمـع از اشک رخـش بـو قـلـمـون سوخت ببزار
جـای اشکـش همـه خـاکستـر طاؤسی ریخت

مـحمد اشرف مسطور حیران مانده لب سخن وا نتـوانسـت کـرد، خـان مـعـز الیـه محضری برین مـاجرا نوشته به مهر سخنوران مسجل گردانید، شـاه آفـریـن لاهـوری بـجـای مهراین بیت ثبت کرده:

گـواهیـم آفـریـن بـر ایـن سـخـن مـا
کـه احـمـد یـار خـان یـکتـا ست یکتا(۱۰۰)

ناصر علی سرہندی:

ناصر علی سرہندی اپنے دور کے چند معروف شعرا میں سے ایک ہے جو سنائی کی

طرح جوانی میں لہو ولعب میں مشغول رہا بعدۂ تائب ہوگیا۔ایسی ہی کہانی ناصرعلی کی بھی ہے جسے خزانہ عامرہ میں ضبط تحریر میں لایا گیا وہ بھی ایک فی البدیہہ شعر کے صدقے میں:

"که در شاهجان آباد قصد ملاقات ناصر علی
کردم در عرض راه بر خوردرت سواره بباغ
بیگم واقع چوک شاهجهان آباد میرفت مرا هم
تکلیف باغ نمود باهم بباغ رفتیم بعد فصلی
دیدم که ناصر علی و یاران او با یکدیگر بایمای
چشم گفتگو میکنند فهمیدم که چه اراده دارند
گفتم مشرب من از مشرب یاران دور افتاده دور
تر رفته نشستم شیشه و پیاله آوردند چون ساقی
می را از شیشه در پیاله ریخت و کفی که از قلقل
در شیشه بهم میرسید ظاهر شد ناصر علی بدیهه
انشا کرد:

کدامین ست را امشب سرخبگ است با زهد(ی)
که مینا هم ز جوش مَی زره زیر قبا دارد

چون مجلس آخر شد و اسباب شرب برداشتند
فقیر برای رخصت رفتم و گفتم بدیهه را در
بیاض فقیر که حاضر است بدست خود بطریق
یادگار ثبت باید کرد ثبت نمود و بالای آن
نوشت بدیهه ناصر علی مستانه فقیر بیت مذکور
را در آن بیاض بچشم خود دیده ام آخر ناصر

علی توبه کرد و از خدمت شیخ محمد معصوم
قدس سره استفاده طریق باطن نمود". (۱۰۱)

ناصر علی کے ساتھ بدیہہ گوئی کا ایک اور واقعہ آزاد نے درج کیا ہے۔ایک بار ناصر نے ایک مطلع سنایا:

خاک گردیدیم و می رقصد هنوز افغان ما
خم شکست اما نمی ریزد می جوشان ما

روزی ناصر علی در صحبت میرزا نظام الدین
احمد طالع تخلص برادر میرزا قطب الدین مائل
مطلع مذکور بر سبیل تفاخر خواند میرزا گفت
مصراع دوم از مولوی روم است:

خم شکست و باده زد نا ریخته
صد درستی در شکست انگیخته

و خود بدیهه این مطلع رسانید:

بر نتابد سنت ساقی دل نالان ما
ساغر لبریز ما بس دیده گریان ما(۱۰۲)

مولانا امام الدین ریاضیؒ:

مولانا امام الدین ریاضیؒ معروف شاعر تو نہیں ہیں۔لیکن اپنے ایک فی البدیہہ مطلع کی بنا پر بہت مشہور ہوئے۔کہتے ہیں کہ طالب آملی کی ایک غزل کے مطلع:

بتن بو یا کند گلهای تصویر نهالی را
بپا بیدار سازد خفتگان نقش قالی را

نہالی اور قالی قوافی کا موزوں کرنا بہت مشکل کام ہے۔ صائب نے اس کے جواب میں غزل تو لکھی مگر مطلع میں یہ قوافی استعمال نہ کر سکے۔ خود ناصر علی سرہندی سے جب اس غزل کا جواب لکھنے کو کہا گیا تو انہوں نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ "این زمین را طالبا برد" لیکن ریاضی نے فی البدیہہ مطلع انہیں قوافی میں کہا اور خوب کہا۔ جسے "ہمیشہ بہار" نے زندہ جاوید بنا دیا:

"تا امروز هیچکس به جواب این کمر نه بسته
حتی که شمع انجمن روشندلی میان ناصر علی
وقتیکه این غزل را دیدند و یاران تکلیف نمودند
که صاحب هم درین زمین چیزی بفرمایند جواب
صاف دادند و گفتند که صاف این زمین را طالبا
برد چیزیکه مانده است درد است هرگز اقدام
نکرد و مثل میرزا صائب شاعر زبردستی که
شعرش شهره هفت اقلیم است و فی الواقع
دریای شعر است وقتیکه بر این زمین آمد در
مطلع قافیه قالی و نهالی نتوانست بست مطلع
غزل این چنین گفت:

تکلف نیست در گفتار رند لا ابالی را
چنانت دوست می دارم که عاشق شعر حالی را

حقیقت این مطلع معلوم و هرگاه ذات شریف

مولانا خواست که بجواب آن پردازد. فی البدیهه فرمودند:

رگ گل کرد آن گل چهره هر تار نهالی را
ازین اندیشه گلها داغ شد بر سینه قالی را

هر که این را شنید گفت ظاهراً این زمین دو صاف داشت یکی را طالبا برد و دوئمی تا حال در کارخانه قضا و قدر پنها بود که بدست مولانا آمد". (۱۰۳)

سید غلام مصطفیٰ فارغؔ:

کبھی کبھی شاعر ایسی الہامی کیفیت میں دل کی بات کہتا ہے کہ وہ قدرتی طور پر پوری ہو جاتی ہے۔ یہ بات سید غلام مصطفیٰ فارغؔ کے قول پر بالکل صادق آتی ہے جو بلند خاں کے لشکر کا حصہ تھے اور گجرات میں ابھے سنگھ کے ساتھ ہونے والی جنگ میں شہید ہوئے۔ شہید ہونے سے قبل انہوں نے ایک رباعی فی البدیہہ کہی تھی۔ جس میں یہ بھی پیشین گوئی کی تھی کہ میرا کفن دفن نہیں ہو سکے گا اور ہوا بھی ایسا ہی کہ جنگ کے بعد ان کی لاش کسی کو نہ مل سکی۔ نہ ان کا جنازہ اٹھ سکا اور نہ وہ بظاہر دفنائے جا سکے۔ ''سفینہ ہندی'' کے مطابق:

''این رباعی قبل از شهادت گفته بود: رباعی

در خلوت ما و رای ما یاری نیست
یعنی که به عرش و فرش اغیاری نیست

ما چون جانیم پاک از آلایش مرگ
ما را بجنازه و کفن کاری نیست
در آن جنگ بعد فتح در کشتگان نعش او را هر
چند تلاش کردند، نیافتند".(۱۰۴)

شیخ عطاءاللہ عطا:

شیخ عطاءاللہ عطا، بیدل کے شاگردوں میں سے ہیں۔ بدیہہ گوئی میں ایسے بے مثل کہ رباعی بھی فی البدیہہ موزوں کر دیتے ہیں۔ جس وقت بیدل نے انہیں قلمدان عنایت کیا تو فوراانہوں نے اس عزت افزائی کے شکریے کے لیے ایک رباعی موزوں کی۔ جسے "ہمیشہ بہار" میں ضبط کرلیا گیا:

"وقتیکه میرزا بیدل از روی عنایت قلمدان به او
عطا کرد عطا این رباعی انشا کرد:

﴿رباعی﴾

بیدل شه اقلیم کمال هر فن
از گوشه چشم دل نظر داشت بمن
از روی عنایتی قلمدان و بیاض
فرمود مرا وزارت ملک سخن(۱۰۵)

جسونت سنگھ پروانہ:

بدیہہ گوئی کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر آپ کسی بڑی شخصیت سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں اور وہ اجازت نہیں دیتا ہے تو یہ فن اسے مجبور کر دیتا ہے کہ وہ آپ سے ملاقات کرے۔ جیسا کہ جسونت سنگھ پروانہ اور شیخ علی حزین کے مابین ملاقات کے سلسلے میں ہوا:

ایک بار شیخ علی حزیں سے ملاقات کرنے پہنچ گئے۔ انہوں نے کہلوا دیا:

دریں بزم رہ نیست بیگانہ را

پروانہ نے فوراً جواب دیا:

(کہ) پروانگی داد پروانہ را (۱۰۶)

حزین اس لطیفۂ فی البدیہہ سے بہت محظوظ ہوئے اور پروانہ کو بلا کر ان کی بڑی تعظیم وتکریم کی۔

منشی بھکھاری لعل عزیز:

آخر میں شاہ عالم بادشاہ کے دور کے ایک ایسے واقعے کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ نام نہاد بادشاہ ہونے کے باوجود اپنی عظمت دیرینہ کو پانے کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔ پانی پت کی لڑائی میں بیرام خاں نے اکبر کو یہ کہہ کر فرار نہیں ہونے دیا تھا کہ ''بادشاہ کے لیے یا تخت ہے یا تختہ'' اور وہ جنگ جیت لی گئی تھی۔ یہاں اکبر کا پوتا اس قول سے بھی بیگانہ ہو کر کسی طرح کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہو رہی ہیں۔ اور بادشاہ سلامت ان کی سرپرستی فرما رہے ہیں۔ ان

حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سبھی نے سپر ڈال دی تھی اور سب ہی محکوم بننے کے انتظار میں تھے۔ منشی بھکھاری لعل عزیز کی بدیہہ گوئی کے سلسلے میں ''سفینہ ہندی'' سے یہ عبارت نقل کی جارہی ہے جس سے اس دور کی بے ربطیوں کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے:

''عزیز بسیار خوش گو بوده، در ایامی که شاه عالم بادشاه خلد الله ملکه در آن صوبه رونق افزا بودند و او با راجه رام ناتھ المخاطب بمیرزا راجه پیوسته، رخصت شاهنامه گوی یافت و یک دو موضع جاگیر حاصل نموده آن چه در آن وقت بنظم می آورد از نظر بادشاه جم جاه می گذرانید این بیت که در صف رقاصان در جشن گفته از آنست:

شدندی چو از بادۂ رقص مست
سر پای شان دل ربودی ز دست

هم او راست در صفت بادشاه گوید:

جهان جسم و جانش شه نامدار
بود تن ز جان دائما برقرار[۱۰۷]

☆☆☆☆☆

مأخذ ومنابع:

(۱) قرآن کریم، سورہ حجرات، آیت ۱۳
(۲) فیروز الغات، مولوی فیروز الدین، فیروز سنز پرائیویٹ لمٹیڈ، لاہور، ۲۰۱۰ء ص ۱۱۴
(۳) فرہنگ آصفیہ، مولوی سید احمد دہلوی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ج ۱، ص ۳۸۶
(۴) فیروز اللغات، ص ۱۹۹
(۵) فرہنگ آصفیہ، ج ۲، ص ۱۴۴۴
(۶) ماہنامہ دار العلوم، شمارہ ۱۰۔۱۱، جلد ۹۶، ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ محرم ۱۴۳۴ھ مطابق اکتوبر۔نومبر ۲۰۱۲ء
(۷) المختصر فی اخبار البشر، تاریخ ابوالفدا، ابوالفدا، مطبع حسینیہ، مصر، ۱۳۲۵ھ ج ۱، ص ۱۲۰
(۸) سیرۃ النبویۃ، ابن ہشام محمد بن عبدالملک، دار المعرفہ، ج ۱، ص ۳۵۲
(۹) حلیۃ الاولیاء، ابونعیم، مطبوعہ سعادت، مصر، ج ۳، ص ۱۳۹
(۱۰) کشف المحجوب، ابو الحسن ہجویری، مترجم فضل الدین گوہر، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۹۲۔۹۳
(۱۱) سفینہ خوشگو، بندرابن داس، تصحیح دکتر سید کلیم اصغر، کتابخانہ، موزہ ومرکز اسناد مجلس شورای اسلامی، تہران۔۱۳۸۹، دفتر دوم، ص ۴۳۷
(۱۲) فارسی کے ادبی لطائف، مقالہ نگار ڈاکٹر محمد تقی علی عابدی، ماہنامہ راہ اسلام، شمارہ ۹۵، فروری ۱۹۹۲ء، ص ۲۰
(۱۳) تاریخ ادبیات در ایران، ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا، چاپ چہارم، تہران، ۱۳۴۲، ص

۱۶۹۔۱۷۰
(۱۴)سخندان فارسی، مولانا محمد حسین آزاد، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۰ء گیارہواں لیکچر، ص۳۸۱
(۱۵) گزیدہ ای از نظم و نثر فارسی، جلد اول نثر کہن، از انتشارات، وزارت فرہنگ و ہنر، ادارہ کل نگارش، بہمن ماہ ۱۳۵۴، ص ۴۸۷۔۴۸۸
(۱۶) چہار مقالہ، مترجم ڈاکٹر حافظ شبیر احمد حیدری، اردو بک ریویو، دریا گنج دہلی، اگست ۲۰۰۷ء۔ ص ۶۴۔۶۶
(۱۷) کلیات اقبال، علامہ اقبال، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۳ء، ص۲۸۱
(۱۸) خزانہ عامرہ، غلام علی آزاد بلگرامی، مطبع نولکشور، کانپور، ۱۲۷۱ھ، ص۳۱۷۔۳۱۸
(۱۹) آتشکدہ آذر، لطفعلی بیگ متخلص بہ آذر، بکوشش حسن سادات ناصری، موسسہ چاپ وانتشارات امیر کبیر ۱۳۳۸، بخش دوم، ص ۴۷۹
(۲۰) ہمان، ص۴۸۲
(۲۱) خزانہ عامرہ، ص۱۴
(۲۲) آتشکدہ آذر، ص۴۷۵
(۲۳) شعر العجم، مولانا شبلی نعمانی، مطبوعہ انوار المطابع لکھنؤ ۱۳۴۱ھ، ج۲، ص۸۷
(۲۴) ہمان، ص۱۰۲۔۱۰۳
(۲۵) دیوان امیر حسن سجزی، بہ تصحیح وحواشی دکتر نرگس جہان، انتشارات بخش فارسی ۲۰۰۳، ص۵۸۵۔۵۸۶
(۲۶) سفینہ خوشگو، دفتر دوم، ص۱۶۶
(۲۷) تذکرۃ الشعراء، تالیف دولتشاہ بن علاء الدولہ بختی شاہ الغازی سمرقندی، بہ اہتمام و تصحیح، ادوارد براون، تہران اساطیر ۱۳۸۲، ص۵۹۷تا۷۸۶

(۲۸) ہمان، ص۲۹۸
(۲۹) نفحات الانس، ابوالبرکات عبدالرحمٰن الجامی، ص۳۸۳
(۳۰) دیوان حافظ، انتشارات آتلیہ ہنر، سہروردی خیابان خرمشہر، ۱۳۸۸، ص۱۳۱
(۳۱) دیوان حافظ، بہ تصحیح دکتر اکبر بہروز، موسسہ انتشارات امیر کبیر، تہران ۱۳۶۳، ص۱۹۱
(۳۲) ہمان، ص۱۹۰
(۳۳) بزم تیموریہ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ستمبر ۲۰۱۵ء، ج۱، ص۳۵
(۳۴) ہمان، ص۳۵
(۳۵) قرآن کریم، سورہ فتح، آیت نمبر ۱۰
(۳۶) ظہیر الدین بابر، پروفیسر قمر رئیس، احمد برادر پرنٹرز، کراچی پاکستان، ۲۰۰۴ء، ص۳۶۔۳۷
(۳۷) منتخب التواریخ، ج۱، ص۳۷۶۔۳۷۷
(۳۸) بزم تیموریہ، ج۱، ص۵۲۔۵۳
(۳۹) ہمان، ص۵۳
(۴۰) سفینہ خوشگو، دفتر دوم، ص۲۱۵
(۴۱) ہمان ص۵۲
(۴۲) ہمان، ص۵۱
(۴۳) دیوان اہلی شیرازی، محمد بن یوسف اہلی شیرازی، بہ تصحیح حامد ربانی، تہران، سنائی ۱۳۴۴، ص۱۵۸
(۴۴) سفینہ خوشگو، دفتر دوم، ص۵۲
(۴۵) ہمان، ص۱۳۷

(۴۶) منتخب التواریخ، حصہ دوم، سوم، ص ۵۵۱۔۵۵۲
(۴۷) سفینہ خوشگو، دفتر دوم، ص ۳۱۸۔۳۱۹
(۴۸) بزم تیموریہ، ج ۱، ص ۱۱۱۔۱۱۲
(۴۹) شعر العجم، ج ۳، ص ۷
(۵۰) بزم تیموریہ، جلد اول ص ۱۱۳
(۵۱) ہمان ص ۱۷۰
(۵۲) ہمان، ص ۱۴۷
(۵۳) شعر العجم حصہ سوم، ص ۷۰۔۷۱
(۵۴) منتخب التواریخ، جلد دوم سوم، ص ۱۱۳
(۵۵) ہمان، ص ۵۰۹
(۵۶) ہمان، ص ۵۳۲
(۵۷) سفینہ خوشگو، دفتر دوم، ص ۱۵۷
(۵۸) آئین اکبری، شیخ ابوالفضل، دفتر پنجم، ص ۲۵۹
(۵۹) ہمان، ص ۲۶۰
(۶۰) شعر العجم، حصہ سوم، ۱۴۰۔۱۴۲
(۶۱) ہمان، ۷۔۸
(۶۲) سفینہ خوشگو، دفتر دوم، ص ۱۵۶
(۶۳) تاریخ حسن، پیر غلام حسن کھویہامی، مطبع گورنمنٹ پریس، سرینگر، ناشر محکمہ تحقیق و اشاعت حکومت جموں و کشمیر، سرینگر، حصہ دوم، ص ۴۸۵
(۶۴) ہمان، ص ۴۸۵
(۶۵) ہمان، ص ۴۸۵

(٦٦) ہمان، ص۴۸۵۔۴۸۶

(٦٧) ہمان، ص۔۴۸٦

(٦٨) ہمان، ص۴۸٦

(٦٩) سفینۂ خوشگو، دفتر دوم، ص۳۳۰

(٧٠) ہمان، ص۳۳۲

(٧١) کلمات الشعرا، محمد افضل سرخوش، دین محمد پریس، لاہور، ۱۱۱۵ھ، ص۱۵۳

(٧٢) توزک جہانگیری، خودنوشت محمد جہانگیر، ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، F/Rare 954.025 JAH، ص۱۱۱

(٧٣) سفینۂ خوشگو، دفتر دوم، ص۵۷۹

(٧٤) ہمان، ص۵۷۸،۔۵۷۹

(٧٥) تذکرہ شعرای فارسی ہمیشہ بہار، کشن چند اخلاص، تصحیح وتحشیہ دکتر زبیر احمد قمر بھارت آفسیٹ پریس، دہلی ٦، ۲۰۰۳، ص۱۳۳۔۱۳۴

(٧٦) سفینۂ خوشگو، دفتر دوم، ص۳۷۵

(٧٧) ہمان، ص۳۷۵

(٧٨) بزم تیموریہ، حصہ سوم، ص۲۴۵

(٧٩) سفینۂ خوشگو، دفتر دوم، ص۳۸۱۔۳۸۲

(٨٠) بزم تیموریہ، حصہ سوم، ص۲۱۵

(٨١) ہمان، ص۲۱٦

(٨٢) ہمان، ص۲۱٦

(٨٣) سفینۂ خوشگو، دفتر دوم، ص۲۳۸

(٨٤) ہمان، ص٦٩٧

(۸۵) ہمان، ص ۶۹۷

(۸۶) مرآۃ الخیال، شیر علی خان لودی، عمدۃ الاخبار ۱۲۶۴ھ، ۱۳۷۷، ص ۲۵۲

(۸۷) بزم تیموریہ، حصہ سوم، ص ۵۳۔۵۴

(۸۸) ہمان، ص ۵۸

(۸۹) ہمان، ص ۸۲

(۹۰) سفینہ خوشگو، دفتر دوم، ص ۲۸۷

(۹۱) واقعات دار الحکومت دہلی، بشیر الدین احمد، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۲، جلد اول، ص ۳۹۲۔۳۹۳

(۹۲) سفینہ ہندی، بھگوان داس ہندی، مرتبہ سید شاہ محمد عطا الرحمٰن، لیبل لیتھو پریس، رمنہ روڈ پٹنہ، ۱۹۵۸ء ص ۶۵۔۶۶

(۹۳) مجمع النفائس، تذکرہ شعرای فارسی سدۂ دوازدہم، سراج الدین علی خاں آرزو، تصحیح و ترتیب عابد رضا بیدار، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، چاپ اول ۱۹۷۷، ص ۱۹

(۹۴) سفینہ ہندی، ص ۲۰۲

(۹۵) مجمع النفائس، ص ۳۲

(۹۶) ہمان، ص ۳۳

(۹۷) سرو آزاد، میر غلام علی آزاد بلگرامی، تصحیح عبداللہ خان، مطبع دخانی رفاہ عام لاہور، ۱۹۱۳ء ص ۱۹۲

(۹۸) سفینہ ہندی، ص ۸۵

(۹۹) خزانہ عامرہ، ص ۲۰۲

(۱۰۰) سفینہ ہندی، ص ۲۶۲۔۲۶۳

(۱۰۱) خزانہ عامرہ، ص ۳۲۹

(۱۰۲) ہمان، ص۳۲۹۔۳۳۱

(۱۰۳) ہمیشہ بہار، ص ۸۷۔۸۸

(۱۰۴) سفینہ ہندی، ص۱۵

(۱۰۵) ہمیشہ بہار، ۱۵۹

(۱۰۶) تذکرہ بہار سخن، برق سیتاپوری، مطبوعہ لیبل لیتھو پریس پٹنہ، ۱۹۲۲ء ص۸۹

(۱۰۷) سفینہ ہندی، ص۱۳۱، ۱۳۲